سہ ماہی

ہمگام

جلد دوئم ۔۔۔۔شمارہ چہارم

جنوری تا مارچ 2015

رابطہ

ای میل Humgaam@ymail.com

ویب سائٹ www.humgaam.net

ٹویئٹر @humgaamnews1

فیس بک Humgaam Magazine

Humgaam The Companion

دفتر ـــــــ

سہ ماہی ہمگام میگزین

نوری نصیر خان روڈ گوادر

بلوچستان

پبلیکیشن ۔ ہمگام پریس

سہ ماہی ھمگام

اس شمارے میں

☆مسلح تنظیمیں اور نظم و ضبط	حسن جانان	3
☆ماضی کی کھچی اور آج کا نصیر آباد	عمر عمرانی	10
☆ مغالطے اور مفروضات	نود بندگ بلوچ	16
☆ بلوچ قومی بقاء کو لاحق خطرات	شبیر بلوچ	23
☆ سیاسی ناپختگی و گمراہ کن پروپیگنڈہ	اسلم بلوچ	25
☆ برطانوی رکن پارلیمنٹ کاانٹرویو		27
☆ افغان مشکلات میں اضافہ	حفیظ حسن آبادی	30
☆ سوشل میڈیا اور بلوچ قومی تحریک	گدان بلوچ	33
☆ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن	ترجمہ آرچن بلوچ	36
☆ عالمی و علاقائی سیاست اور ہم	حمل بلوچ	37
☆ بی ایس او کے افکار و کردار	نود بندگ بلوچ	42
☆ دیوار (افسانہ)	سارتر	52
☆ ادارتی مضامین		62

مسلح تنظیمیں اور نظم وضبط

ــــ تحریر۔حسن جانان

نظریہ کے بعد کسی بھی تنظیم کی مستحکم ومضبوط ہونے کا ضامن اس تنظیم کے اندر نظم وضبط ہی ہوتا ہے۔کوئی بھی سیاسی سماجی یا ادبی ادارہ جس میں نظم وضبط نہیں ہوگی۔ وہ تنظیم وادارہ برائے نام ہی ادارہ کہلائے گا۔کیونکہ نظم وضبط سے ہی ادارے کی حیثیت وساخت برقرار رہ سکتی ہے۔کسی بھی تنظیم کا نظریہ جتنا بھی مضبوط ہو جتنا بھی پختہ ہو۔اگر اسمیں ڈسپلن کا فقدان رہا تو وہ تنظیم کہلانے کے لائق نہیں رہے گا۔اسی وجہ سے نظریہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ نظم وضبط ہی اس تنظیم کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے۔اگر نظریہ جتنا بھی پختہ ہو مستحکم ہوا گر اس تنظیم میں ڈسپلن نہ رہا تو نظریہ کے ساتھ تنظیم بھی غیر مستحکم ومنتشر ہوگا۔اسی تناظر میں بلوچ مسلح تنظیموں کے ڈسپلن کے حوالے سے ان پر باریک بینی سے دیکھا جائے تو ہمیں بہت سے ایسے شواہد ملیں گے جو موجودہ حالات تک سیاسی صورتحال کو پہنچانے کے ذمہ دار قرار دیے جاسکتے ہیں۔اب ان تنظیموں کے حوالے سے انکے ابتدائی عوامل پر نظر دوڑائیں گے کہ تنظیمی حوالے سے ان میں کس حد تک نظم وضبط کا فقدان تھا۔ویسے کوئی بھی تنظیم پہلے دن سے مکمل طور پر غلطیوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔لیکن غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ وقت وحالات کے ساتھ نئے نئے قوانین متعارف کرنا اور لاگو کرنا لازمی امر ٹھہرتا ہے اگر غلطیوں پر روایتی انداز میں سوچا گیا اور ان کا حل روایتی انداز سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو حالات مزید بگڑ کر اس تنظیم کی ساکھ کو متاثر کرتے ہیں اور عوامی سطح پر اس تنظیم سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔احتساب کا عمل کسی بھی تنظیم میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور کسی بھی سپاہی یا رہبر کے کردار وعمل کو اس تنظیم کے ڈسپلن ونظریے پر فوقیت حاصل ہونے کے بجائے نظریہ وڈسپلن کو اہمیت دی جائے تو احتسابی عمل سے غلطیوں میں کمی آسکتی ہے۔ سوچ سمجھ کر کسی بھی کام کے حوالے سے سنجیدگی کے ساتھ ہی کوہی صحیح لائحہ عمل مرتب کرنا ہی اس تنظیم ونظریہ کی بقاء کی ضمانت دے سکے گا۔

بلوچ نظریہ آزادی کے توسط سے بلوچ معاشرے میں پہلے مزاحمتی تنظیم بی ایل اے ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔کیونکہ ماضی کے بعد جب پورا بلوچ سیاست وفاقی سیاست کے نرغے میں تھا۔ہر طرف پارلیمانی سیاست کا چرچہ وشوشا تھا۔اور قومی حق خودارادیت کے مبہم نعرے کے ساتھ جدوجہد کے تمام ذرائع کو استعمال کرکے پارلیمنٹ کے لیے جو راستہ ہموار کیا گیا تھا تمام سیاسی ورکر ماضی کی سیاسی ناکامیوں کے بعد جدوجہد کے تمام ذرائع سے استفادہ کرنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔جو لوگ مکمل آزادی کے حامی تھے۔وہ بھی انہی پارلیمنٹ زدہ پارٹیوں میں اپنے کمزور اعصاب کے ساتھ جدوجہد کررہے تھے۔کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ پھر سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مزاحمتی جدوجہد کا کوئی بھی راستہ اختیار کرسکتا ہے۔لیکن نواب خیر بخش مری کی سٹڈی سرکلز سے کچھ نوجوان تربیت لے چکے تھے اور حیر بیار مری کی سرکردگی میں پہلی بار مزاحمتی حوالے سے سوچنے وبلوچ وطن کی آزادی کے لیے نئے راستے ڈھونڈ رہے تھے اور انھوں نے ہی مزاحمتی حوالے سے کافی سوچ بچار کے بعد ایک مزاحمتی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ماضی کے تجربوں کو سامنے رکھتے ہوئے منظّم انداز میں تنظیم کے قیام اور آنے والے سخت حالات سے نمٹنے کے لیے تنظیمی ڈھانچے کو ابتداء سے ہی مخفی رکھا اور تنظیم کے اندر سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ ڈسپلن کو انتہائی سخت رکھا گیا کیونکہ ماضی کے تنظیمی ڈھانچے اور ڈسپلن کے نقصانات سے بخوبی واقفیت رکھنے کے ساتھ نئے تنظیم کا قیام ومتوقع حالات سے نمٹنے کے لیے تنظیمی ڈھانچہ سمیت تمام سپاہیوں کی سیاسی تربیت کو اولین ترجیحات میں رکھا گیا اور تنظیم غیر محسوسانہ انداز میں 1996 سے لیکر 2001 تک مخفیانہ طریقے سے تنظیم کاری اور تنظیم کے لیے معاشی ذرائع پیدا کرنے کی کوششیں کرتا رہا۔ابھی تک وسائل کی پوراوری وتنظیم کے دیگر چھوٹے اداروں کی تشکیل مکمل نہیں ہوئی تھی اور بلوچستان کے تمام علاقوں تک بی ایل اے کی رسائی نہیں ہوئی تھی کہ ریاست نے جسٹس نواز مری کے قتل کا بہانہ بنا کر ان تمام افراد کو گرفتار کرلیا۔جو کہ اس جدوجہد میں پیش پیش تھے۔نبی داد مری،نورا مری وقبیل سے لیکر اسلم بلوچ وشہید غفار لانگو تک سب گرفتار کرلیے گئے اور انھیں جسٹس نواز مری کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔اور ان سے تفتیش افغانستان میں جلاوطنی کے حوالے سے کی گئی تھی اور جسٹس نواز مری کے قتل کا بہانہ بنا کر ریاست سوچ آزادی کو مکمل طور ختم کرنے کی کوشش میں رہا کہ جو لوگ آزادی کے جنگ کا حصہ رہے تھے انھیں مکمل طور ریاست کا تابعدار بنانے کی کوشش کی جائے اور نواب خیر بخش مری سمیت مری قبیلے سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد جو کہ ریاستی مشینری کا حصہ نہ بنے بلکہ ان کے دلوں میں آزادی کی جہد کا ولولہ زندہ رہا اسی بنا پر جسٹس نواز مری کے قتل کا ڈرامہ رچا کر نواب خیر بخش مری کو گرفتار کیا گیا اور حتی الامکان یہ کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طریقے سے نواب خیر بخش مری کو پارلیمانی سیاست کی طرف لے جاسکیں لیکن ریاست خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کرسکا تو سب کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔نواب کی گرفتاری کے بعد حالات نے کروٹ لی۔اور تنظیمی حوالے سے مسلح مزاحمتی کاروائیاں شروع کی گئی۔اس طرح مزاحمتی جدوجہد کے مسلح کاروائیوں کا آغاز ہوگیا۔آغاز سے لیکر آج تک بی ایل اے بحثیت مزاحمتی تنظیم ڈسپلن کے حوالے سے کبھی بھی مصلحت کا شکار نہ

> **احتساب کا عمل کسی بھی تنظیم میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور کسی بھی سپاہی یا رہبر کے کردار و عمل کو اس تنظیم کے ڈسپلن و نظریے پر فوقیت حاصل ہونے کے بجائے نظریہ و ڈسپلن کو اہمیت دی جائے تو احتسابی عمل سے غلطیوں میں کمی آسکتی ہے۔**

ہوا بلکہ ہر سپاہی سے لیکر کمانڈر تک سب کو تنظیم نے ایک ہی نظر سے دیکھا اور سخت سے سخت حالات میں نظریہ و ڈسپلن پر مصلحت سے گریز کرتا رہا اور ہر مسئلے کو مرکزیت کے تحت حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور تنظیمی ڈھانچہ بھی مخفی رکھا گیا۔ کسی بھی ذمہ دار شخص کے اختیارات کا تعین ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا گیا سوائے مرکزی لوگوں کے جو کسی بھی مسئلے سے ہر ذمہ دار کیمپ کمانڈ سے صلح مشورہ کرتے رہے اور انھی کے صلح و مشورے سے مسائل کے حل اور نئی پالیسی مرتب کرتے رہے۔ اس وقت اس سوچ کو مدنظر رکھا گیا تھا کہ اگر کسی کے سامنے اسکے اختیارات کو واضح کر کے پیش کیا جاتا ہے تو پھر ان اختیارات کا استعمال ناگزیر طور پر ناجائز بھی ہوتا ہے۔ تمام ذمہ دار ایک ساتھ چلتے ہوئے باہمی صلح و مشورے سے آگے بڑھتے رہے اور ماضی کے اثرات لیے ان لوگوں کے کردار و عمل کو ہر کام کے حوالے سے مدنظر رکھا گیا۔ نیت، خلوص، بے غرض، جذبہ قربانی، بے لوث جہد، ذمہ دارانہ سوچ سمیت معاملہ فہمی کو مدنظر رکھ کر ان لوگوں کو ذمہ داریاں دی گئی اور ہر وقت ان پر نظر رکھی گئی کہ وہ اپنے کام کے حوالے سے کتنے سنجیدہ و ذمہ دار ہیں۔ اس طرح مرکز ہر ذمہ دار پر نظر رکھ رہی تھی۔ اسی سوچ کی وجہ سے تنظیم میں ڈسپلن سے لیکر فکر و نظریہ تک ہر قول و فعل کو پرکھنے کے بعد کسی کے ذمہ داریاں بڑھائی گئی یا کم کیے گئے اور اس سارے عمل میں تمام کیمپ کمانڈ و دیگر افراد جو ان سے کام کے حوالے سے منسلک تھے۔ ہر عمل کے حوالے سے مرکز سے معلومات شیئر کرتے رہے۔ اسی وجہ سے مرکز کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی رہی۔ اسی وجہ سے گروپ بندی سے لیکر من پسندی جیسے ناسور تنظیم میں پنپ نہیں سکے۔ اس طرح تنظیم کسی بھی مسئلے پر مصلحت پسندی کا شکار نہ ہوا بلکہ ہر مسئلے کے حل کو قومی مفاد و تنظیمی قوانین و اصولوں کے تحت دیکھا گیا لیکن یہ بھی ضروری نہیں، کہ کوئی تنظیم غلطیوں سے پاک ہو بلکہ ہر تنظیم غلطیوں سے سیکھ کر ہی مزید غلطیوں کے لیے دروازے بند کر سکتی ہے۔ بی ایل اے ایک مزاحمتی تنظیم ہے اور انسان کے مزاج و طبیعت و سوچ کا بھروسہ نہیں رہتا کیونکہ انسان کے ذہن میں چھپے پوشیدہ خیالات کو کوئی سائیکولوجیکل ڈاکٹر بھی نہیں جان سکتا۔ جب تک وہ اپنے علاج و تحلیل نفسی کے حوالے سے راضی نہ ہو، یہ انسانی فطرت ہے کہ اس میں شوق اختیار، لالچ، بدنیتی، بدعملی و بدفعلی، حسد جیسے سماجی بداعمالیاں موجود ہوتی ہیں اور اپنی انسانی فطرت کی وجہ سے ان افعال سے پاک ہونا ہی اسے عظیم کام و عظمت کے درجے تک پہنچا سکتا ہے بصورت دیگر وہ لالچ، شوق اختیار، حسد بدنیتی و بدفعلی کی وجہ سے بہت سے ایسے کام کر سکتا ہے جو کہ مجموعی حوالے سے تحریک و تنظیم کے لیے نقصان دہ ثابت ہونگے۔ اسی طرح انھی انسانی افعال و اعمال کے بدولت ہر تنظیم و ادارے میں ایسے افراد کی کمی نہیں اور ایسے افراد ہر ادارہ و ہر قوم میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کی تاریخ ایسے کرداروں سے بھری پڑی ہے اور انھی کرداروں کی وجہ سے بہت سے ادارے ٹوٹتے ہیں اور تحریکیں ناکامی کا شکار ہوتے ہیں۔ بی ایل اے بھی انسانوں کا ایک مجمع یا گروپ ہے اور ظاہر ہے اسمیں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی، ایسے لوگوں کو مضبوط ڈسپلن ہی پابند بنا سکتا ہے اور انکے کردار و عمل کو سیدھے راستے پر لا سکتا ہے کیونکہ فطرتاً بہت کم ہی لوگ ایسے سماجی بداعمالیوں سے پاک ہونگے اور مضبوط تنظیمی ڈسپلن و مضبوط سوچ ہی لوگوں کے منتشر خیالات کو خط مستقیم پر لے جا سکتا ہے۔ کسی بھی ادارے میں صرف قومیت کے جذبے کو مدنظر رکھ کر انھیں آزاد نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے معاشی معاشرتی ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے کیونکہ آزادی کا مطلب ہی اپنے لیئے من پسند پابندی کے قوانین ہیں اور یہ قوانین کوئی تنظیم اپنے سپاہیوں سمیت اپنے تنظیم سے منسلک ہر فرد پر لاگو کرتا ہے اور اسی ڈسپلن کی بدولت ہی وہ جدوجہد کو نتیجہ خیز بنا سکتی ہے۔ اگر دنیا کے تمام افواج کو دیکھ لیں تو اس میں کم ہی لوگ وطن پرستی کے نام پر بھرتی ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر لوگ ذریعہ معاش کی وجہ سے بعض شوق سے و بعض فوجی طبیعت کی وجہ سے و بعض ایڈوینچر سمجھ کر بھرتی ہوتے ہیں لیکن ان مختلف خیال لوگوں کو صرف ڈسپلن ہی پابند بنا سکتا ہے اور انھیں ہر قربانی کے لیے تیار کرتا ہے اور ڈسپلن ہی انھیں مرنے مارنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی فوجی اپنے شوق سے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ ڈسپلن اسے مجبور کرتا ہے اور وہ ڈسپلن کے تحت ہی مرنے مارنے سے نہیں کتراتا اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی فوج کے سارے سپاہی وطن پرستی کے تحت بھرتی نہیں ہوتے بلکہ وہ پروفشنل ہوتے ہیں اور انھیں پروفیشنل ہی ڈسپلن بناتا ہے اور یہ ڈسپلن ہی ہے جو کسی بھی ادارے میں غلطیوں سے لیکر ہر برے عمل کی روک تھام کرتا ہے اور انھیں احتساب کے عمل سے گزارتا ہے، لیکن آزادی کی تحریکوں میں صورتحال کچھ مختلف ہوتی ہے، کیونکہ ان تحریکوں میں لوگ صرف وطن پرست ہو کر ہی جدوجہد کا حصہ بنتے ہیں اور ایک تنظیم میں سبھی سپاہی ایک ہی خیال کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ مختلف خیالات رکھنے والے یہ لوگ ایک نظریہ کے تحت ایک ساتھ ہوتے ہیں اور ان میں بھی حسد، بدنیتی جیسے برائیاں ہوتی ہیں، ان برائیوں کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا لیکن انہیں ضرور کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ آپ مضبوط ڈسپلن کے تحت ہی ان مختلف الخیال لوگوں کو ایک ساتھ جوڑ سکتے ہیں اور انسانی فطرت کے منفی خیالات کو پنپنے سے

روک سکتے ہیں۔ بلوچ لبریشن آرمی ایک وطن پرست قومی مزاحمتی تنظیم کی حیثیت سے اکیسوی صدی میں بلوچ مزاحمتی جہد کے ٹوٹے ہوئے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے تو تنظیم میں مختلف خیالات کے لوگ ایک نظریے کے تحت جمع ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ برے انسانی اعمال جو کہ انکی فطرت کا حصہ ہے وہ اعمال وقت و حالات کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔لیکن اگر بروقت انکی روک تھام نہ کی گئی تو گروپ بندی تقسیم در تقسیم و تنظیم کے اندر بدنظمی کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور اگر ایک کمانڈر یا ذمہ دار کہ کسی بھی وجہ سے تنظیمی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اسے اس لالچ پر معاف کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مضبوط گروپ کی حیثیت سے تنظیم میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے اور اسے اس خوف سے احتساب کے عمل سے نہیں گزارا جاتا کہ اس کا احتساب کرنے سے وہ تنظیم کو چھوڑ سکتا ہے تو یہاں سے تنظیم کی موت کی بیماری سر اٹھاتی ہے کیونکہ ایک مصلحت تمام تنظیمی قوانین کو تہہ و بالا کر دیتا ہے اور پھر ہر سپاہی و ذمہ دار کے لیے راستے کھل جاتے ہیں اور یہ عمل ایک روایت بن جاتی ہے۔اس بابت بلوچ لبریشن آرمی کسی بھی حوالے سے ازل سے مصلحت کا شکار نہ رہی۔اور تسلسل کے ساتھ احتساب کا عمل ہر سطح پر جاری رکھا۔سنزل بڑانی مری 1973 سے قومی جدوجہد سے منسلک رہا تھا اور تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد جب 1996 میں تحریک کی دوبارہ

نظریہ کے بعد کسی بھی تنظیم کی مستحکم و مضبوط ہونے کا ضامن اس تنظیم کے اندر نظم و ضبط ہی ہوتا ہے۔کوئی بھی سیاسی سماجی یا ادبی ادارہ جس میں نظم و ضبط نہیں ہوگی وہ تنظیم و ادارہ برائے نام ہی ادارہ کہلائے گا۔کیونکہ نظم و ضبط سے ہی ادارے کی حیثیت و ساخت برقرار رہ سکتی ہے۔کسی بھی تنظیم کا نظریہ جتنا بھی مضبوط ہو جتنا بھی پختہ ہو۔اگر اسمیں ڈسپلن کا فقدان رہا تو وہ تنظیم کہلانے کے لائق نہیں رہے گا۔اسی وجہ سے نظریہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط ہی اس تنظیم کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے۔

بنیاد رکھی گئی تو موجودہ تحریک میں ماضی کے تحارک کی قبائلی حالات کو مکمل طور پر مدنظر رکھ کر تحریک کو سائنسی خطوط پر رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔قبائلی اثر رسوخ و قبائلی حیثیت سے زیادہ ہر فرد کے کردار و عمل کو دیکھا گیا۔سنزل بڑانی ایک تجربہ کار جہد کار تھے اور موجودہ تحریک میں ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے تھے، تنظیمی امور پر سنزل مری ہمیشہ سے روایتی رہا اور عسکری کام کو بھی روایتی نقطہ نظر سے دیکھتا رہا جس پر ایک دو دفعہ اس پر سوال بھی اٹھے تھے لیکن اسکے بعد بھی وہ ماضی کے تنظیمی اصولوں کو مدنظر رکھ کر فیصلے لیتا رہا تھا جبکہ موجودہ حالات کے تقاضے کچھ اور تھے اور وہ روایتی طرز و طریقے کے تحت اپنی قبائلی حیثیت کو سامنے رکھ کر تنظیمی اصولوں کو دیکھتا رہا اور خود پر سوال اٹھنے اور جواب دینے کو اپنی توہین سمجھتا رہا۔وہ یہی سمجھتا رہا کہ ایک تجربہ کار کمانڈ کی حیثیت سے کسی سپاہی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سوال اٹھائے اور تنظیمی امور پر جب تنظیم کی جانب سے اسے دیگر کے سامنے جوابدہی کے لیے کہا گیا تو اس پر وہ ناراض ہو گیا تھا کہ میں تو تجربہ کار ہوں اور اس جونیئر کو میں جوابدہ نہیں اور اسی طرح کے ایک دو اور عسکری مسئلے بھی سامنے آئے تھے جس پر سنزل مری نے روایتی بن کر تنظیمی اصولوں کو توڑنے کی کوشش کی تھی جس پر اسے سخت تاکید کی گئی لیکن وہ اپنے روایتی سوچ کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا اور تنظیم اپنے اصولوں پر ڈٹا رہا۔اس طرح ناڑی مراد جسکے سپرد تنظیمی عسکری وسائل کو سنبھالنے کی ذمہ داری تھی، وہ عرصہ دراز سے یہ کام سرانجام دے رہا تھا لیکن اس کے حوالے سے اکثر شکایتوں کی سلسلہ اس بنیاد پر رہا تھا کہ وہ تنظیمی وسائل کو کسی دوسرے کیمپ پہنچانے یا دینے میں اکثر پس و پیش سے کام لیتا ہے اور اکثر عسکری کاموں میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے اور وسائل دس من مٹی تلے دبا کر کسی ضرورت مند کیمپ کو دینے پر راضی نہیں ہوتا۔بار بار کہنے پر وہ بہانہ بنا کر اپنی گلو خلاصی کی کوشش کرتا رہا اور دیگر سپاہیوں کی بھی اکثر اسکے کام کے حوالے سے شکایتوں کا سلسلہ جاری تھا۔جب ذمہ دار اشخاص انہیں کسی کیمپ کو وسائل فراہم کرنے کے حوالے سے کہتے تو وہ پس و پیش سے کام لے کر ٹال مٹول کرتا رہتا تھا۔جس پر اسے کئی بار تاکید کی جا چکی تھی۔

ناڑی مراد جو ہزار خان رامکانی کا قریبی دوست رہا تھا اور موجودہ حالات میں ہزار خان رامکانی کے گھر میں پناہ لینے سے اس کے اس مضبوط رشتے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ناڑی مراد میں بدنیتی اور حسد جیسے کمزور فعل ازل سے موجود تھے جبکہ وقت حاضر میں تحریک میں ایسے کمزور لوگوں کے لیے حالات سخت سے سخت ہوتے جا رہے تھے اور جنگ کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، شہری گوریلا جنگ میں بھی تیزی آ چکی تھی اور دیگر باصلاحیت نوجوان جو عسکری و سیاسی سماجی حوالے سے زیادہ باشعور تھے ناڑی مراد کے ان کمزوریوں پر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اپنے ماضی کے تجربے کو بنیاد بنا کر کسی بھی یا کسی مثبت صلاح و مشورہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ ان کے خون میں روایتی طرز طریقہ کار دوڑ رہی تھی اور اسے بار بار تنظیمی حوالے سے تاکید کی گئی تھی لیکن وہ اپنے تجربے کے گھمنڈ میں نظم و ضبط کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کی کوشش میں لگا رہا۔جس پر اسے تنظیمی حوالے سے جوابدہ ہونا پڑا۔اس جوابدہی کو وہ اپنی توہین سمجھ کر ان منفی اعمال کو مزید تواتر کے ساتھ دہراتا رہا جس پر اس کے دائرہ اختیار میں کمی کی گئی، لیکن وہ تنظیمی وسائل جو اس کے سپرد تھے وہ انہیں

اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا اور وسائل کو تنظیم کے حوالے سے انکاری ہوگیا۔قادر مری جو کہ 1973ء سے قومی تحریک سے جڑا ہوا تھا اور موجودہ تحریک کی بنیاد رکھنے میں شامل رہا تھا اور اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا کے ذمہ قومی عسکری وسائل کی حفاظت وشہری لوگوں کی ٹریننگ کی ذمہ داری سپرد تھی۔قادر مری بھی ناڑی مراد کی طرح مرکز کی جانب سے کسی کو وسائل دینے پر کوتاہی برتتا رہا، وہ وسائل پر مامور اپنے اختیارات کا رعب ودبدبہ ظاہر کرتا اور ضرورت مند کیمپوں کو وسائل دینے میں پس وپیش سے کام لیتا رہا قادر مری بھی ناڑی مراد کی طرح موجودہ حالات سے ناواقف تھا اور ماضی وموجودہ حالات میں فرق سے نابلد نظر آتا تھا اور تنظیمی اصول جو کہ ماضی میں قبائلی اثر ورسوخ کی بنیاد پر بنتا اور ٹوٹتا وہ ان حالات میں بھی اسی سوچ کے تحت کام کررہا تھا اسے بار بار مرکز کی جانب سے ہدایت دی گئی تھی جس پر وہ پابند نہیں رہا اسے موقع دیا گیا تا کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ادراک کرسکے کہ وہ مرکز کی مرکزیت کو سمجھ کر اپنے رویوں میں تبدیلی لائے۔قادر مری عسکری حوالے سے دس سال تک کوئی خاص کارکردگی بھی نہیں دکھا سکا بلکہ وہ ہمیشہ سے کیمپ میں ہی رہے تھے اور اسے کسی کاروائی کے حوالے سے کہا جاتا تو وہ ہر بار موسم کا بہانہ آڑے لا کر ٹال دیتا، ان کوتاہیوں کا سلسلہ دس سال تک محیط ہے۔ان دس سالوں میں انہوں نے ایسا کوئی خاص کارنامہ سر انجام نہیں دیا اس بنا پر مرکزی قیادت نے اختیارات کو قادر مری کے بدلے کاہان شفٹ کردیئے۔قادر مری پر یہ ناگوار گزری لیکن اسکے رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، تنظیمی کاموں کے بدلے وہ قبائلی مزاج کے ساتھ بگٹی قبیلے سے تعلقات بڑھانے میں جٹھا رہا۔اسے اس وقت بی آر اے کی مدد کرنے کے لیے جو ذمہ داریاں دی گئی تھی۔وہ تنظیم کے بجائے اسے قبائلی انداز میں کرتا رہا اور بگٹی قبیلے سے تعلقات بڑھانے اور اپنی قبائلی اثر ورسوخ کو بڑھانے کی کوشش میں لگا رہا۔اس پر تنظیم نے اسے سخت تاکید کی تھی کہ وہ روایتی انداز میں سوچنے کی بجائے انقلابی حوالے سے اور تنظیم کے پالیسیوں کو مدنظر رکھ کر سوچے اور تنظیمی پالیسیوں کے تحت کام کرے لیکن وہ ہر بار روگردانی کرتا رہا۔تنظیم نے اسے تاکید کی تھی کہ بی آر اے کے ساتھ رشتہ علاقائی وقبائلی نہیں بلکہ ایک قومی تنظیم کی حیثیت سے ہے اس سے ہم ایک قومی تنظیم کی حیثیت سے رشتہ استوار کرچکے ہیں لہٰذا قبائلی مزاج وقبائلی رویے تحریک کے لیے نقصان دہ ثابت ہونگے لیکن قادر مری اپنے روایتی قبائلی انداز کے ساتھ چلتے ہوئے بی ایل اے کے کیمپ کو مکمل بی آر اے کا کیمپ بنا دیا۔ناراز داری کا خیال رکھا گیا اور نا ہی تنظیمی اصولوں کا بلکہ وہ روایتی انداز میں تمام مسائل کو دیکھتا رہا۔اسی طرح تنظیم نے ایک پھر اس پر بعض مسئلوں کے حوالے سے پابندی عائد کردی لیکن پھر بھی وہ اپنے رویوں میں تبدیلی لانے پر راضی نا ہوا۔اسی طرح انہوں نے اپنے 1973 کے واقعات کو قلمبند کردیا اس کتاب کے چھپنے کے بعد ہی تنظیم کو اس کے اس عمل کا پتہ چلا کیونکہ اس وقت کتاب میں بہت سے ایسے ناموں کو ظاہر کیا گیا تھا جو کہ ریاستی نظر میں نہیں آئے تھے اور کتاب میں بہت زیادہ قیاس آرائی کی گئی تھی اور یہ کتاب بھی تنظیم سے صلح مشورہ کے بجائے اپنے مرضی سے چھاپی گئی تھی۔اس پر تنظیم نے اس کے تسلسل کے ساتھ غلطیوں پر چھوٹے چھوٹے پابندیاں لگا تا رہا۔تا کہ اسے احساس دیا جاسکے اور جو لوگ اس کے ساتھ کیمپ میں موجود تھے بہت سے اختلاف رکھ کر دیگر کیمپوں کو روانہ ہوئے اور قادر مری اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کیمپ میں رہا۔کلاتی بی ایل اے کا ایک ساتھی تھا اور اس کا بھائی شہید بالاچ کے ساتھ کام کررہا تھا جب ڈیرہ بگٹی پر ریاستی آپریشن شروع ہوا اور نواب اکبر خان بگٹی شہید تراتانی کے مقام پر قیام پزیر تھے تو شہید بالاچ اور دیگر ذمہ داروں کے صلاح ومشورے سے بی ایل اے کے بہت سے سپاہی ڈیرہ بگٹی کی جانب راونہ کیے گئے تھے۔ان سپاہیوں میں سے ایک کلاتی کا بھائی شاہ گل بھی تھا۔جب یہ لوگ میدان جنگ کے قریب پہنچے تو شاہ گل نے میدان جنگ میں جانے کی بجائے میدان جنگ سے بھاگنے کو ترجیح دی، جو کہ عسکری قوانین وتنظیمی قوانین کے خلاف تھا اور بلوچ رسم ورواج کے تحت بھی یہ فعل بزدلانہ فعل تھا شاہ گل بغیر کوئی مضبوط وجہ بتائے دیگر ساتھیوں کو چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔دیگر سپاہیوں اور ذمہ داروں کی منت سماجت پر بھی وہ نہ رکا اور یہ کہتا ہوا میدان جنگ چھوڑ کر چلا گیا کہ میں نواب بگٹی کے لیے اپنے آپ کو قربان نہیں کرسکتا۔شاہ گل کے اس عمل پر بی ایل اے نے سزا کے طور اس سے ناطہ توڑ دیا اور اس سے تنظیمی رابطے منقطع کیے گئے۔ایک شخص جو کہ میدان جنگ میں تنظیم اور اپنے ساتھیوں کو دھوکہ دے سکتا ہے تو اسکا کوئی بھروسہ نہیں۔وہ کسی وقت بھی کوئی بھی عمل کرسکتا ہے۔شاہ گل سے تنظیمی ناطہ توڑنے پر کلاتی نے بھی یہ کہہ کر روایتی وقبائلی انداز میں اپنے بھائی کی پیروی کو ترجیح دی کہ میں اپنے بھائی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔کلاتی پر اس سے پہلے علاقے میں کچھ ایسے الزامات بھی لگ چکے تھے کہ وہ علاقے میں چوری واختیارات کا ناجائز استعمال کررہا ہے اس پر اسے سزا بھی دی گئی تھی۔اس طرح کلاتی نے اپنے بھائی کو تنظیم سے فارغ کرنے پر اپنے بھائی بندی کو ترجیح دی اور اپنے بھائی کی طرف داری کی جس پر بی ایل اے نے اس سے بھی ناطہ توڑ دیا۔اگر ان لوگوں کے حوالے سے کسی بھی صورت مصلحت پسندی کا مظاھرہ کیا جاتا تو صورتحال یکسر مختلف ہوتی، وقتی فائدے ضرور ہوتے لیکن لمبے عرصے کے لیے یہ نقصان کا سبب بنتے۔ناڑی مراد قادری مری سنزل بڈانی جیسے لوگ وقت وحالات کے ساتھ خود کو تبدیل نہیں کرسکے بلکہ جس تجربے سے وہ خود گذرے تھے اسی کو بنیاد بنا کر ہر عمل کا پیمانہ اسی کو بناتے رہے اور سیاسی دنیا سے دور رہنے کی وجہ سے نئے سوچ ونئے خیالات کو ہضم نہ کرسکے بلکہ اسی قبائلی طرز جہد کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔1970 سے لیکر 2008 تک دو نوجوان نسل تیار ہوچکے تھے اور مختلف سوچیں پرورش پاچکے تھے، جس سے ایک جنریش گیپ آچکا تھا نوجوان نسل پرانے خیالات سے باغی تھے اور بزرگ نئے خیالات کو قبول کرنے سے انکاری رہے لیکن حقیقت ہی اصل حقیقت ہوتی ہے اور دنیا بھی وقت کے ساتھ بدلتا ہے اور پالیسیاں وسوچیں وقت وحالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اگر ان میں جمود آگیا تو وہ تباہی کے دہانے پر پہنچاتے ہیں اور اگر انہیں زبردستی زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی تو صورتحال ٹکراو کی صورت میں ہوگا اس طرح نئے وپرانے خیالات کے بیچ ایک فاصلہ پیدا ہوگیا اور پرانے خیالات کے بجائے نئے

خیالات تشکیل پاتے رہے اور پرانے خیالات نئے خیالات کے زیر اثر ہو کر دب جاتے ہیں لیکن یہ سلسلہ صرف بزرگوں کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ نوجوانوں میں بھی انھی خیالات کے لوگ ہوتے ہیں اور اسی انداز میں سوچتے ہیں جو کہ نصف صدی پہلے بزرگ سوچتے تھے۔ اسی طرح مہران مری بھی بی ایل اے کا حصہ تھے، حیربیار مری کی لندن میں گرفتاری کے بعد تنظیمی امور کی بہت سی ذمہ داریاں اسکے کاندھوں پر آ گئے اور وہ بھی اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مالی حوالے سے مہران نے تمام وسائل کو دیگر تنظیمی ذمہ داروں سے رابطہ اور صلح مشورے کی بجائے اپنے من پسند افراد سے تعلقات کو وسعت دینے کیلئے استعمال کرتا رہا اور تنظیمی مالی وسائل کو بے دریغ خرچ کرتا رہا۔ حساب کتاب کے حوالے سے بھی بی ایل اے کے دیگر اداروں سے رابطے کے بغیر سب کچھ انجام دیتا رہا، جس کی وجہ سے اس کے دور میں بی ایل اے کمزور رہا اور تنظیم بحرانی کیفیت میں چلا گیا اور عسکری وسائل کو مہران مری نے ان ناعاقبت اندیش لوگوں کے سپرد کر دیا جو اس سے پہلے بی ایل اے کے سزاء یافتہ اشخاص تھے۔ انہوں نے بی ایل اے کے دیگر ذمہ داروں سے رابطہ منقطع کر دیا۔ حیربیار مری کے رہائی کے بعد مہران مری سے پوچھ گچھ کی گئی اور ان سے دو سال کے دورانیے کے مالی و عسکری وسائل کا حساب کتاب مانگا گیا۔ انھوں نے جو حساب دیا وہ غیر تسلی بخش تھا، جب اس سے واپس حساب مانگا گیا اور کچھ اخراجات کی وضاحت مانگی گئی تو وہ اس پر انکاری ہو گیا۔ جس کی وجہ سے بی ایل اے اسے سزاء دینے پر غور و غوض کرنے لگا، بی ایل اے ابھی تک حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ یو بی اے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس طرح تمام سزاء یافتہ و احتساب زدہ اشخاص نے اکھٹے ہو کر نئے متحدہ تنظیم کی بنیاد رکھ دی اور بی ایل اے کے سزایافتہ افراد کا یہ ٹولہ نئے تنظیم کے ساتھ متعارف ہوا۔ آج یہی مذکورہ بالا اشخاص یو بی اے کے والی و وارث ہیں۔ یہ تمام افراد تنظیمی ڈسپلن کی وجہ سے اپنے غلط افعال و اعمال کی وجہ سے سزاء یافتہ قرار پائے گئے تھے، اگر اس سوچ کو دیکھیں جس پر بی ایل اے بحیثیت قومی تنظیم مصلحت پسندی کا شکار نہ ہوا اور قومی مفادات و تنظیمی اصولوں پر ڈٹا رہا اور تنظیم کے تمام ساتھیوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا رہا ظاہر کرتے ہیں کہ بی ایل اے نے بحیثیت مزاحمتی تنظیم کسی بھی مسئلے پر مصلحت نہ کی اور ہر سطح کے ذمہ داراں کو غلطی کی سزا دی، اسے جزاء و سزا کے عمل سے گزارا اور ڈسپلن کی سختی سے پابند بنانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلح تنظیموں میں بی ایل اے واحد مضبوط تنظیم کی حیثیت سے متعارف ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی بی ایل اے کو ایک مکمل نظم و ضبط کا پابند ادارہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قومی آزادی کی اس تحریک میں اسے اور بھی مزید سخت فیصلے کرنے ہونگے۔ اور اپنے ڈسپلن کو مزید مضبوط و منظّم بنانے کی ضرورت ہے۔ بی آر اے بحیثیت مزاحمتی تنظیم جس وقت متعارف ہوئی۔ اس وقت قبائلی سوچ کے ساتھ لوگ اس تنظیم سے وابستہ ہو گئے اور ان کی وابستگی اس وقت جذبات کی وجہ سے تھی لیکن بی آر اے نے قبائلی سوچ کے تحت اپنے ذمہ داروں کا چناؤ کیا۔ جو قبیلے کے نامی گرامی لوگ تھے انہیں ذمہ دار بنایا گیا۔ جس کی مثال بنگان بگٹی سے عالی و وڈیرہ پیرو تک کا سفر ہے۔ اسی طرح بگٹی قبیلے کے تمام شاخوں کے سربراہاں کو ذمہ دار بنایا گیا اور ہر قبیلے کا شاخ اپنی مرضی کے مطابق اپنے کمان کی سلکیشن کے ساتھ ساتھ اپنے سپاہی و جگہ کا سلیکشن کرتا تھا جو کہ روایتی طرز طریقہ تھا۔ اسی بناء پر کہ کچھ ہی عرصے بعد نصف کے قریب قبائلی شخصیات سرکار سے جا ملے۔ بی آر اے میں کسی کی غلطی پر جزاء و سزا کی کوئی حد مقرر نہیں تھا۔ بی آر اے کے نوشکی کیمپ میں جہاں پر حاجی بگٹی نامی بگٹی قبیلے کا ایک شخص کمانڈر مقرر تھا اس کے حوالے سے علاقے کے لوگوں کی بار بار شکایت کی گئی تھی کہ وہ علاقے میں عورتوں کو تنگ کرنے جیسے منفی اعمال میں ملوث پایا گیا ہے اور لوگوں کی بار بار شکایت پر بی ایل اے نے بحثیت قومی تنظیم اپنی ذمہ داری کو نبھاتا رہا اور بی آر اے کے مرکزی قیادت کو اس بارے میں آگاہ کرتا رہا یہاں تک کہ مکران کیمپ کے کمانڈ گلزار امام کو اطلاع دی گئی جس پر گلزار امام و حاجی کے مابین کچھ جھگڑا بھی ہوا تھا لیکن حاجی پر بی آر اے نے کوئی ایکشن نہیں لیا بلکہ وہ اسی طرح ہر روز پہاڑی علاقے میں لوگوں کے گھروں میں کام کے بہانے جا کر مہمان بنتا اور وہ بلوچی معیار کے تحت اس کی خدمت کرتے لیکن وہ ان کے لیے وبال جان بن کر ہر روز ان کے گھر پہنچ جاتا۔ لوگ اس کے ان رویوں کی بار بار شکایت کرتے اور بی ایل اے کی قیادت حاجی بگٹی کے ان رویوں

بی ایل اے بحیثیت قومی تنظیم مصلحت پسندی کا شکار نہ ہوا اور قومی مفادات و تنظیمی اصولوں پر ڈٹا رہا اور تنظیم کے تمام ساتھیوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا رہا ظاہر کرتے ہیں کہ بی ایل اے نے بحیثیت مزاحمتی تنظیم کسی بھی مسئلے پر مصلحت نہ کی اور ہر سطح کے ذمہ داراں کو غلطی کی سزا دی، اسے جزاء و سزا کے عمل سے گزارا اور ڈسپلن کی سختی سے پابند بنانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلح تنظیموں میں بی ایل اے واحد مضبوط تنظیم کی حیثیت سے متعارف ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی بی ایل اے کو ایک مکمل نظم و ضبط کا پابند ادارہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قومی آزادی کی اس تحریک میں اسے اور بھی مزید سخت فیصلے کرنے ہونگے۔ اور اپنے ڈسپلن کو مزید مضبوط و منظّم بنانے کی ضرورت ہے۔

پر بی آر اے کی قیادت کو کہتا رہا لیکن بی آر اے کی قیادت اس پر دو سال تک خاموش رہی۔ پھر بالآخر جب خود علاقے کے لوگوں نے اسے ایک بے ہودہ حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیا اور اس پر سیاہ کاری کا الزام لگا اور علاقائی معتبرین نے اسے بی آر اے کے حوالے کیا تو پھر بعد میں مجبوراً بی آر اے نے اسکے خلاف ایکشن لیا اور اسے گرفتار کرلیا۔ اسی طرح بی آر اے کے ایک اور ذمہ دار رحیمو بگٹی نے وڈیرہ پیرو بگٹی کی بیٹی کو گھر سے بھگا کر شادی کی جس پر بی آر اے کے اندر بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن پھر بھی براہمدغ بگٹی نے اس پر خاموشی اختیار کی کیونکہ وڈیرہ پیرو براہمدغ بگٹی کو چھوڑ کر طلال بگٹی کے ساتھ چلا گیا تھا اس پر بی آر اے نے قبائلی رسم و رواج کے تحت کوئی قدم نہیں اٹھایا اور نہ ہی اس مسلئے کے حل کرنے کی کوئی کوشش کی اور نہ ہی بروقت اپنے سپاہیوں و ذمہ داروں کی غلطی پر انھی سزا دی اور نہ ہی احتساب کے عمل سے گذارا اور اسی وجہ سے بی آر اے ہر واقع میں مصلحت کر کے اپنے ڈسپلن کو مزید بگاڑتا رہا۔ مستونگ میں آزادی پسند تنظیموں کے ایک ہمدرد کو بی آر اے نے قتل کیا اور اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی جس پر بی آر پی سے تعلق رکھنے والے بہت سے سیاسی کارکنوں نے اس مسئلے پر احتجاج کیا اور تنظیم سے مستعفی ہوئے۔ اسی طرح مکران میں بی آر اے کی ڈسپلن کی حالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ سپاہی اپنی مرضی سے چوری ڈکیتی جیسے واردات میں ملوث پائے گئے ہیں اور پنجگور میں تریاق و کرسٹل سے بھرے تین گاڑیوں کو لوٹ کر لے گئے تھے اس واقعے میں ایک کاروباری شخص مارا گیا تھا، تریاق لوٹنے کے بعد بی آر اے کے سپاہی آپس میں گھتم گھتا ہو گئے اور ایک دوسرے پر بندوقیں تان لیں ہر ایک تریاق میں اپنا حصہ بڑھانے کی بات کر رہا تھا۔ ایک دفعہ جب پنجگور میں شہید سعید نے اپنے دوستوں کے ساتھ جب روڈ و پل کا کام بند کروایا جس میں بی آر اے کا ایک سپاہی بھی شہید ہوا تھا تو کچھ ہی عرصے بعد گلزار امام نے 30 لاکھ روپے لیکر بی ایل ایف کے ہمراہ اس روڈ پر کام کی اجازت دے دی۔ اسی طرح گلزار امام کے بھائی سے لیکر بہت سے بی آر اے کے ممبر جو کہ ریاستی کارندے بن چکے ہیں یا پہلے سے ہی تھے، گلزار سمیت بی آر اے ان کے حوالے سے کوئی ایکشن نہیں لیتا۔ مقبول شمبے زئی جو کہ ایک ریاستی دلال ہے جو پنجگور میں بی آر اے و بی ایل ایف کے زیر کنٹرول علاقے میں سرعام گشت کرتا پھر رہا ہے اس کو مارنے کے حوالے سے بی آر اے کے ایک سپاہی نے کہا کہ گلزار امام کو اس بارے میں ہم نے بہت کہا لیکن اس نے کہا ہے کہ اگر میں بی آر اے کی جانب سے مقبول کو ماردوں تو اسکے قتل پر میرے لیے خاندانی مسئلے پیدا ہونگے خاندانی مسئلے کو بنیاد بنا کر ایک غدار کو زندہ چھوڑنا مزید سرمچاروں کی شہادت کے دروازے کھولنا ہے۔ حال ہی میں شہید اصغر کا واقعہ پیش آیا ہے، شہید اصغر بی آر اے، بی ایل ایف اور بی ایل اے سب کے ہمدرد کے طور کام کرتا تھا اور بی آر پی کا پنجگور زون کا صدر بھی تھا۔ پچھلے سال لیویز سے اسلحہ لوٹنے پر دو ڈاکو مارے گئے اور زہیر نامی ایک ڈاکو زخمی بھی ہوا تھا جس پر بی آر اے کے اس وقت کے کمانڈ ساربان نے لیویز والوں کو دھمکی دی کہ یہ لوگ ہمارے تنظیم کے تھے آپ نے انہیں مارا ہے اسکا انجام آپکو بھگتنا ہوگا۔ جب زہیر کی جیل سے رہائی ہوئی تو انہوں نے ڈکیتی کے دوران قتل ہونے والے دونوں شخص کے قتل کا ذمہ اصغر پر ڈال کر اسے قتل کر دیا، اس واردات میں بی آر اے کا ایک اور ذمہ دار شخص بھی زہیر کے ساتھ تھا۔ اس کاروائی کی پلاننگ بی آر اے کے کیمپ میں کی گئی تھی۔ دو سال کے بعد اسلحہ لوٹنے والے دو ڈاکو جو مارے گئے تھے انھیں بی آر اے نے اپنے بیان میں کہ وہ ہمارے تنظیم کے شہید ہیں اور تنظیمی حکمت عملی کے تحت اس وقت ان کو ظاہر نہیں کیا گیا ساتھ میں اصغر کو بی آر پی نے شہید قرار دے دیا لیکن اسکے قاتلوں کو اپنے کیمپ میں بٹھایا ہوا ہے۔ ایسے بہت سے ویل و واقعات ہیں جو کہ تسلسل کے ساتھ ہو رہے ہیں ان پر بی آر اے مکمل خاموش ہے چوری ڈکیتی سے لیکر آئل ٹینکروں کو لوٹنا دکانداروں سے زبردستی پیسے لینا تسلسل کے ساتھ ہو رہے ہیں اور علاقے کے لوگوں نے مرکزی قیادت تک اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ لیکن ہر بار خاموشی ہی مقدر رہے۔ یہ بی آر اے کی ڈسپلن کی حالت ہے۔ بی ایل ایف کی حالت یہ ہے کہ سیف الدین نامی مخبر جس کے ہاتھ بلوچ نوجوانوں کے خون سے رنگے ہیں اسے ڈاکٹر اللہ نظر معاف کر دیتا ہے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار یہ سننے کو ملا ہے کہ کسی تنظیم نے کسی غدار کو معاف کر دیا ہے حالانکہ غدار کو معاف کرنا یا نہ کرنا قومی نقصان و فائدے کو دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں ڈاکٹر نے سیف الدین کو اس بنیاد پر معاف کیا تھا کہ اس نے معافی مانگنے کے ساتھ ڈاکٹر اللہ نظر کی مالی معاونت کی تھی۔ بی ایل ایف کی حالت مکران میں کچھ ایسی ہے کہ مکران میں آئے روز کسی نہ کسی معصوم کو اپنے خاندانی دشمنی کے بنیاد پر مخبر قرار دے کر مار دیتے ہیں اور وسائل پیدا کرنے کے لیے چوری ڈکیتی کو تنظیمی پالیسی قرار دیا گیا ہے۔ بی ایل ایف نے تین چار سال سے تریاق لوٹنے پر اپنے سپاہیوں کو مامور کیا ہوا ہے۔ دوسری طرف دیکھیں تو بی ایل ایف کی آواران قیادت و کیچ قیادت کی پالیسیاں تک یکساں نہیں۔ اندرونی طور پر ان مسئلوں پر آپس میں اختلافات رکھتے ہیں۔ بی ایل ایف کے سردو نامی سپاہی نے دو معصوم بلوچوں کو خاندانی دشمنی کی بنیاد پر قتل کر دیا تھا، جس کے بنا پر اسے بی ایل ایف نے تنظیم سے نکال دیا، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہ واپس تنظیم میں واپس پرانے پوزیشن پر لے لیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بی ایل ایف کی قیادت اپنے وسائل پیدا کرنیوالے سپاہیوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو چکا ہے۔ بی ایل ایف میں ڈسپلن نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہی ہے اور بی ایل ایف میں سب سے بڑا مسئلہ اسکی پالیسیوں کا ہے بی این پی عوامی سے لیکر بی این پی مینگل و علی حیدر محمد حسنی کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ علی حیدر محمد حسنی جو کہ نور امری کی مخبری کا ذمہ دار ہے۔ بی ایل ایف کے اس سے قریبی تعلقات ہیں۔ بی ایل ایف مزید اس سے تعلقات کو مضبوط کر رہی ہے۔ بی ایل ایف کا اپنوں کے لیے علیحدہ پالیسی ہے اور عوام کے لیے علیحدہ۔ ڈاکٹر اللہ نظر کے بھائی اور اختر ندیم کا چچا جو موجودہ پاکستان کی آزادی کے دن ایف سی کیمپ میں جا کر پاکستان کی آزادی کے پروگرام میں شرکت کرتا ہے اور ساتھ میں دشمن اسے مزید ذمہ داریاں دیتا ہے۔ اس پر بی ایل ایف خاموش ہے۔ کیونکہ گلزار امام کی طرح اسے بھی خاندانی جنگ کے خوف سے مارا نہیں جا رہا۔ بی ایل ایف کے سپاہی اپنے مرضی سے پنجگور اور

تربت کے نواحی علاقے میں چوری ڈکیتی کرتے پکڑے گئے ہیں اور حال ہی میں بلیدہ کا واقعہ پیش آیا، جہاں پر بی ایل ایف نے وسائل پیدا کرنے کے لیے علاقائی پیٹرول انبار پر حملہ کر کے پیسے لوٹ لیے اور پھر راستے میں دوران جنگ انکا ایک سپاہی مارا گیا اور دیگر حملہ آوروں سے دو مارے گئے جس میں بی ایل ایف کے لوگ پکڑے گئے بعد میں علاقے کے لوگوں نے بی ایل ایف کے خوف سے انھیں چھوڑ دیا اور یعقوب بالگتری جو کہ ماضی میں بی ایل ایف کا ساتھی رہا تھا اور اب ایک ہمدرد بن چکا تھا اور بی ایل ایف کو مالی مدد و کمک کر رہا تھا اسے کام کے بہانے بلا کر قتل کیا گیا، ان کے آپسی رشتے کی آڈیو ریکارڈنگ بھی آچکی ہے۔ اس طرح کے واقعات مکران میں روز کا معمول بن چکے ہیں۔ ہر سپاہی کی پالیسی مرکز سے علیحدہ ہے اور جو لوگ ان سے انھی مسئلوں پر اختلافات رکھتے ہیں تو انھیں جان کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اسی بنا پر حلیم دشتی و نکچول بہار کو شہید کیا گیا اور قمبر قاضی کی شہادت بھی کچھ ایسے ہی حالات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ بی ایل ایف ان دونوں کے قتل کی وجوہات و انکے قاتلوں سے بخوبی واقف ہے اور اپنے بیان میں اس کا اظہار کر چکا ہے لیکن قریبا ڈیڑھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اس حوالے سے کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ بی ایل ایف کے سپاہی اپنے چوری و ڈکیتی کو مرکز کی پالیسی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرکز ہمیں مجبور کرتی ہے کہ وسائل پیدا کرنے کے لیے چوری ڈکیتی و لوٹ مار کریں لیکن مرکز اس سے انکاری ہے۔ اسطرح اگر یہ انکے مرکز کی پالیسی ہے تو بی ایل ایف آزادی پسند تنظیم کہلانے کے لائق نہیں، اگر یہ انکے مرکز کی پالیسی نہیں تو اس تنظیم کو تنظیم کہنا گناہ تصور ہوگا کیونکہ اس میں ڈسپلن نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہی ہے۔ چوری ڈکیتی کے آج تک کے تمام واقعات جو عوامی سطح پر ہوئے ہیں ان میں سے بی ایل ایف نے آج تک اپنے ایک سپاہی کو بھی سزا نہیں دی ہے۔ نال میں لیویز سے اسلحہ لشکر بلوچستان چھین لیتی ہے اور وہی اسلحہ بی ایل ایف کو فروخت کرتی ہے، اسطرح قومی تحریک کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ بی ایل ایف، بی آر اے اور لشکر بلوچستان نے منشیات کے جتنی بھی گاڑیاں چھینی ہیں وہ تمام کے تمام تریاق و کرسٹل بلوچستان میں سستے داموں فروخت کی ہے، لیکن دوسری طرف تریاق کا کاروبار کرنے والوں کے گھروں پر حملہ کرنا بھی ان کا معمول بنا ہوا ہے۔ دونوں کاروبار کے عمل سے گزر رہے ہیں، ایک کاروباری شخص جو صرف کاروبار کر رہا ہوتا ہے اسے تریاق بیچنے اور اسکا کاروبار کرنے سے روکنے کے لیے اس پر حملے کیے جاتے ہیں۔ جب کہ بی ایل ایف بی آر اے اور لشکر بلوچستان وہی تریاق لوٹ کر خود بیچ دیتے ہیں اور دوسری طرف تریاق کا کاروبار کرنے والوں پر حملے کرتے ہیں اگر یہی حملے خود پر کرے تو یہ انصاف ہوگا بی ایل ایف نے قومی تحریک کے لیے وسائل پیدا کرنے کے نام پر چوری ڈکیتی اور منشیات کے کاروبار کو وسائل پیدا کرنے کا نام دیا ہوا ہے۔

کچھ ہی سالوں کی جہد کے بعد تنظیمی ڈسپلن کی حالت یہ ہے تو تحریک کی وسعت کے ساتھ ان تنظیموں کی حالت پھر کیا ہوگی۔ اب اگر اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کر سکے تو یہ عین ممکن ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ تنظیمیں منتشر ہو جائیں گے، اور ہر ایک گروہ اپنے علیحدہ شناخت کا اعلان کر دے گا اور ہر تنظیم مختلف ٹولوں کی صورت میں نئے نئے تنظیم کی صورت میں ظاہر ہونگے۔ عوامی سطح پر عوامی حمایت بھی انہی حرکات کی وجہ سے کم ہو چکی ہے۔ کسی بھی تنظیم میں فکر کے بعد بنیادی عنصر اسکے ڈسپلن کا ہوتا ہے، اگر کسی ملک میں ڈسپلن نہ ہو تو وہ منتشر ہوگا اور اسمیں انارکی پھیلنے کا خطرہ ہوگا۔ یہ تو کسی آزاد ملک کی صورتحال ہوگی۔ لیکن ایک محکوم قوم کے آزادی کے تنظیمیں جس میں ڈسپلن نہ ہوگی تو پھر کچھ عرصے کے بعد چوری و ڈکیتی و ریاستی کارندے بن کر عوام کا جینا حرام کر دینگے۔ وطن پرستی کے نام پر اکھٹے ہونے والے افراد کو تربیت کے ساتھ انہیں پابند ڈسپلن ہی بنا دیتا ہے جس کی وجہ سے مرکزیت کے دائرے کے تحت وہ اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔ جب تنظیم میں ڈسپلن کا فقدان ہوگا تو رفتہ رفتہ یہ کمزور ڈسپلن بھی ختم ہوگا اور ادارے کا نام نشان تک نہیں رہے گا اور ہر ٹولہ اپنے مرضی کے مطابق جو چاہے کرے گا۔ اور پھر ایک ٹولے کا ہمدرد دوسرے کا دشمن قرار دیا جائے گا جس طرح موجودہ حالات میں تمام مزاحمتی تنظیموں میں بی ایل اے کا غدار بی این ایم کا ممبر و ہمدرد نکلتا ہے۔ آج یہ مسائل تنظیموں کے حوالے سے نظر آتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد ٹولوں میں نظر آئیں گے کیونکہ سیاسی پختگی کی بجائے تعداد بڑھانے کے چکر میں بی آر اے اور بی ایل ایف نے ہر ایک کو بھرتی کر لیا اور غلطیوں پر مصلحت کر کے دیگر سپاہیوں کو راستے دیا گیا۔ اسی بنا پر آج انکے اندر کے مجموعی حالت کنٹرول سے باہر ہے اور دوستی و سنگتی و منت سماجت کے تحت اپنے سپاہیوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ایک سپاہی پر دباؤ ڈالا جاتا ہے تو جواب میں وہ دوسرے سپاہی کے ساتھ نرم رویہ کو جواز بنا کر اپنے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ اسطرح ڈسپلن کے فقدان کی وجہ سے مرکزی پالیسیاں بھی متاثر ہوئی ہیں، اب مرکزی پالیسی بھی ہر علاقے کے حوالے سے تبدیل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرکزیت نہیں رہی اور چوری ڈکیتی لوٹ مار اور سماجی برائی جیسے حرکات آزادی پسندوں میں سر اٹھا چکی ہیں، یہ سلسلہ دن بدن ابتر صورتحال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ان مسئلوں پر تمام مزاحمتی تنظیموں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے کیونکہ اگر اپنے ڈسپلن اور پالیسیوں پر نظر ثانی نہیں کی گئی اور اپنے غلط اعمال و حرکات کو جواز دینے کی کوشش کی گئی تو اس سے مزید حالات خراب ہوتے جائیں گے اور ہر غلط عمل کو جواز دینے کی کوشش کی جائے گی، جس سے ایک منفی سوچ جنم لے گی، اسطرح ایک تسلسل کے ساتھ یہ اعمال ہوتے رہیں گے لیکن ان کے عوض نہ رہے گی تنظیم اور نہ رہے گی تحریک، صرف انارکی و افراتفری میں سب ایک دوسرے کو مارتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

عمر عمرانی کی خصوصی کی تحریر

ماضی کے کچھی اور آج کے نصیر آباد و جعفر آباد پر ایک نظر

کسی قوم کی تاریخ دراصل اس قوم کے گزشتہ تجربات کا خزانہ ہے۔ویسے اگر دیکھا جائے تو تاریخ بلوچستان خود ایک سوالیہ نشان ہے، صحیح تاریخ جو بلوچ قوم کی صحیح تشریح کرتی ہو، وہ بد قسمتی سے ہمارے کسی تاریخی کتاب جو ملکی یا غیر ملکی مورخوں نے لکھی ہو اس کو حقیقی کا درجہ دینا ناکافی سمجھا جائے گا، کیونکہ کہیں تاریخ کا مرکز خان قلات کے گرد جھومتا ہے اور کہیں انگریز مورخین اس کو اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر بیان کرتے ہیں۔لیکن جہاں تک کچھی کی بات ہے تو اس علاقے کا کوئی حد بندی کسی کتاب میں صحیح معنوں میں نہیں کی گئی ہے، اس کو دریا بولان کے اختتام سے شروع ہو کر دریا مولا کے اختتام (پیر چھٹہ) سے ہوتا ہوا بھاگ سے شروع ہو کر خان گڑ (جیکب آباد) تک اس کے حدود کا تعین کرتے ہوئے لکھا جا چکا ہے، یہ ایک ایسا علاقہ تھا جو بیشتر چکنی مٹی کا ایک بنجر اور بے شجر میدان تھا، اور مشرق اور شمال میں بلند خشک پہاڑوں کی وجہ سے یہ علاقہ انتہائی خشک ہوا کرتا تھا اور گرمیوں کے مہینوں میں یہاں رہن سہن بہت تکلیف دہ ہوا کرتی تھی، اور گرم موسم میں اکثر جھکڑ (twister) چلتے تھے، ویسے بھی پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے گرد غبار کے بادل چھائے ہوتے تھے، اور ان جھکڑوں کو ایک انگریز کک نے اپنی نوٹس میں یوں بیان کیا ہے کہ "بلوچ ان کو شیطان کہتے تھے اور وہ ان کو بھوت پریت سمجھتے تھے "اور کارلیس نے ایک جگہ یوں بیان کیا تھا" یہ بگولے میدان پر بہت تیز رفتاری سے گھومتے تھے اور جب کوئی ہمارے قریب آتا تو ہمارا رہنما سردار بڑبڑاتا:" حضرت شیطان! سڑک سے ہٹ جاو اور مجھے کوئی زک نہ پہنچاو، میں تو صرف اس انگریز کے ساتھ بیلہ جا رہا ہوں جو جام کے لئے تحائف لے جا رہے ہیں" مثلاً اس کی تیز گرم تپش کی وجہ سے اس وقت کے بلوچ اس کو شیطان سے تشبیہہ دیا کرتے تھے اور یہاں اتنی تیز گرم ہوا چلتی جو کبھی بھی گرمی کے تناو کے بدلنے سے وجود میں آکر پیدا ہوا کرتی تھی اور جس جگہ سے گزرتی ہر شہ کو لگ بگ جلا کر رکھ دیتی تھی، اور اس کی تپش اتنی زیادہ ہوتی کہ انگریز اسے "تندور" بھٹی" سے نکلنے والی گرم ہوا سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔یہاں اکثر کنووں کا پانی کھارہ اور مضر صحت ہوا کرتی تھی، بیشتر آبادی دریا بولان، بھاگ، اور دریا مولا کے قریب آباد تھی، اور بارش کے بعد کاشت کاری کیا کرتے تھے۔آبادی میں خیال یہ کیا جاتا ہے کہ بلوچوں سے پہلے یہاں ابڑو، ہورا، منجو، پلال پساڑ تو فیہ اور کہیں کہیں کلہوڑا، کھوکھر رہا کرتے تھے جو آج بھی پائے جاتے ہیں۔بلوچوں کی کچھی آمد سے پہلے کچھ بلوچ قوم کی تاریخ پر نظر دوڑانہ لازمی ہوگا کہ کہاں سے کیوں اور کیسے آئے، جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ مورخین نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب بلوچوں کے شعر و شاعری کہانیاں اور بلوچی ٹپ سے اخذ کیئے گئے ہیں، ان میں سے کونسی کتاب کتنی مستند ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ ان سے کچھ حوالے لینا ضرور چاہونگا، ایک حوالہ یہ دیا جاتا ہے کہ ایران کے کوہ البرز سے آئے ہوئے بلوچ سراوان و جھالاون میں آکر یہاں آباد ہوے دوسرا کوہلب شام سے آئے بلوچ مکران میں آکر آباد ہوئے، اور تیسرا ناروائی ہرات کے گرد و نواں میں آکر آباد ہوئے۔1:البرز کے مقام پر بلوچ قوم پہاڑوں پر بسیرہ کرتی تھی اور اس کا ذریعہ معاش لوٹ مار پر منحصر تھا جس کی وجہ سے اس وقت کے بادشاہ نوشیروان نے ایک لشکر تیار کر کے ان کی سرکوبی کے لیے نکالا اور ان کی اس جگہ پر زبردست قتل عام کیا گیا۔ایرانی سپاہ کے قتل عام سے بلوچوں کے اس فرقہ یا قبیلہ کے جتنے افراد بچ نکل سکے، انہوں نے اپنے آبائی وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا اور سردار میر قمبر کی سرکردگی میں بلوچوں کا یہ طائفہ، سیستان، دربار، چاغی اور خاران سے ہوتا ہوا ماراپ، سیاہ کنب اور جھالاوان کے پہاڑوں میں آکر رکا، چونکہ یہ ایسا کوہستانی قبیلہ تھا جس کے افراد کوہ البرز کی گھاٹیوں میں بڑے ہو کر پروان چڑھے تھے، اس لیے جھلاوان کے پہاڑوں میں پہنچ کر ان کو اپنے آبائی وطن کی ایک جھلک نظر آئی۔پہاڑوں کے قدرتی قلعوں سے ان کی ڈھارس بندھی اور آہستہ آہستہ وہ سوراب، ماراپ، سیاہ کنب اور قلات کے گرد و نواح میں آباد ہونا شروع ہوئے اور اس علاقے کو اپنا وطن بنالیا۔اس زمانہ میں قلات اور قلات کے گرد و نواح میں ایک قدیم ہندو خاندان کی حکومت تھی۔وہ غالباً دراوڑی زبان بولتے تھے، سوراب، خضدار، اور کرخ وغیرہ میں جاموٹ آباد تھے، بلوچوں کا یہ نوارد کوہستانی قبیلہ بُرز کوہ یعنی کوہِ البرز سے ہجرت کر کے آیا تھا۔یہاں کے دراوڑی زبان بولنے والے باشندوں میں "بُرز کوہی" قبیلہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔جو رفتہ رفتہ دراوڑوں کی لفظ سے بگڑ کر "بروہی" یا "براہوئی" پڑ گیا۔بلوچوں کا یہ قبیلہ بلوچستان میں آج اسی نام سے مشہور ہے۔یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ کے بلوچوں میں کسی غیر بلوچ قبیلہ سے ازدواجی رشتہ ناطہ کرنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔لیکن اس قبیلے کے افراد کو مجبوراً یہ رسم ترک کرنی پڑی، کیونکہ اس قبیلہ کے بیشتر عورتیں اور لڑکیاں ایرانی سپاہ کی غارتگریوں کا شکار ہو چکی تھیں اور جو بچ پائیں تو ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔اس لئے اس قبیلہ کے بلوچوں کے لیے یہاں کے اصلی باشندوں سے الگ تھلگ رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ان میں یہ طاقت بھی نہ تھی کہ اپنے آبائی وطن کی طرف واپس پلٹ سکتے، اس لیے انہوں نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا جو

آ گئے چل کر بلوچستان کے نام سے مشہور ہوئی۔2: دوسری روایت یہ ہے کہ کچھ بلوچ دجلہ اور فرات کی وادیوں اور حلب کے مرغزاروں میں آباد تھے، اور کہا جاتا ہے کہ یزید اور امام حسین کی لڑائی میں بھی بلوچوں نے امام حسین کی اعانت کی اور جب امام حسین کی شہادت ہوئی تو وہ بچ بچا کر پھر سے حلب کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئے اور گزارہ معاش حاصل کرنے کے لئے لوٹ مار کا سہارہ لیتے ہوئے شہری علاقوں کو لوٹا کرتے تھے، یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تا نکہ بنوامیہ کے خونی گورنر حجاج بن یوسف نے تنگ آ کر ان بلوچوں پر حملہ کر دیا، بلوچوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس جابر گورنر کا مقابلہ کر سکتے مجبوراً ان کو ان پہاڑوں سے ہجرت کرنی پڑی۔3: ایک اور روایت کے مطابق سردار جلال خان کی سرکردگی میں بلوچوں کے چوالیس قبیلے حلب سے ہجرت کر کے ایران آئے، اور بقام بفین سکونت پزیر ہوئے۔ چونکہ ان قبائل کا مال ومتاع حجاج بن یوسف کی غارتگری کی بھینٹ چڑھ چکا تھا، اور ان کا گزارہ معاش تنگ تھا اس لئے یہاں بھی لوٹ مار شروع کی گئی جس سے ایرانی تنگ آ کر بلوچوں کی سرکوبی کر کے انکے لشکر کو نکال دیا اور بلوچوں کو شکست دے کر وہاں سے نکال باہر کیا۔ ایران سے نکل کر یہ لوگ ایران سیستان او اور مکران آئے۔ مند اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر بزورِ شمشیر قبضہ کر کے رہن سہن اختیار کی سردار جلال خان کچھ وقت بعد یہاں فوت ہو گیا۔ سردار جلال خان کے رند، لاشار،، ہوت، اور کُرہ نامی چار لڑکے اور مائی جتو نامی لڑکی تھی۔ جسے سردار جلال خان نے اپنی زندگی میں مراد نامی اپنے کسی رشتہ دار سے بیاہ دیا تھا۔ سردار جلال کے فوتگی کے بعد رند کو اپنا سردار منتخب کیا گیا اور کئی پشتوں تک مکران میں رہنے لگے اب یہاں بلوچ قوم کی پہلی حکومت کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہیں، بلوچی حکومت کی تاریخ ان "برزکوہی" یا "براہوئی" بلوچ سے شروع ہوتی ہے جو رند بلوچوں سے بہت پہلے قلات کے گردونواح میں آ کر آباد ہو چکا تھا، اور اس زمانہ میں جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قلات پر سیوا نامی ایک ہندو دراوڑ خاندان کی حکومت تھی، پندھرویں صدی کے وسط میں تقریباً جب ہندوستان پر منگولوں کا سیلاب آنا شروع ہوا تب سیوا خاندان ان کی زد میں آیا جس سے ان وحشی منگولوں کے ہاتھوں اس خاندان کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کی حکومت الٹ گئی۔ منگولوں کا جیسا کہ دستور تھا سیوائی دراوڑوں کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو تلوار سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور نوجوانوں کو تو چُن چُن کر ہلاک کیا گیا۔ اسو وقت میرو جو کہ میر قمبر کی نسل سے تھا اور جس کی اولاد بعدازاں میروانی مشہور ہوئے۔ اس زمانے میں براہوی طائفے کے بلوچوں کا سردار تھا۔ میرو موقع شناس اور بہادر تھا۔ اس نے اس تبدیلی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ہوا کا رخ دیکھ کر میرو نے اپنے بہادر قبائل کے ساتھ منگولوں کا ساتھ دیا، ان کے لئے لڑائیاں لڑیں، حتیٰ کے منگولوں کی انتہائی خوشنودی اور اعانت حاصل کر کے میرو نے چھپر، زیارت اور دشت گوران سے دراوڑوں کو ماراپ، سیاہ کنب، گدر اور سوراب سے جدگالوں کو نکال باہر کیا اور ان کی ارضیات پر خود قابض ہو کر بیٹھ گیا۔ اس انقلاب سے میرو کے قدم علاقے میں مضبوطی سے جم گئے۔ چند سال بعد جب منگولوں کا سیلاب رُک گیا اور ہندوستان سے ان کے بادل چھٹ گئے۔ تب قلات میں بھی ان کی حکومت کمزور ہو گئی۔ قندھار کے ارغون خاندان نے قلات پر فوج کشی کی منگولوں کو شکست ہوئی اور ارغون قلات پر قابض ہو گئے، اس وقت میرو فوت ہو چکا تھا اور اس کا لڑکا عمر بلوچوں کا سردار تھا۔ یہاں بلوچوں کی حکومت کی شروعات ہوتی ہے۔

برطانیہ نے بلوچستان پر یکسر مختلف انداز سے حکمرانی کی کیونکہ باقی علاقوں کے نسبت بلوچستان بنجر علاقہ تھا اور یہاں حکمرانی کی نوعیت فوجی طرز کی تھی اسی لیئے باقی برصغیر کے نسبت یہاں معاشی ترقی کیلئے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے تھے، ان کا تعلق قبائلی عمائدین کے ساتھ تھا وہ ان کو وظیفہ دیا کرتے تھے اور اس کے عوض بلوچستان پر حکومت کیا کرتے تھے۔ اسلیئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کے قلات، مکران، خاران، اور لسبیلہ میں صرف ایک ہی اسکول تھا جو کے مستونگ میں قائم تھی۔ جب بلوچستان آزاد ہوا تب تک کالج کا نام ہو نشان بھی نہیں تھا،

1۔ بلوچ جو باہمی رقابت اور خانہ جنگیوں کے باعث مشہور ہیں جب قلات پر قابض ہونے کی خبر مکران میں بلوچوں کو ملی تو ان کو یہ بات بالکل بھی راس نہیں آئی کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اور بلوچ سردار ہونے کا کیسے دعوٰی کر سکتا ہے اور اس مد میں انھوں نے قلات کا رخ کیا، (کہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں خشک سالی کی وجہ سے انھوں نے قلات کی طرف رخ کیا، اور ایک فوج کی تشکیل دی گئی تا کہ وہ نئی زمین دیکھ کر لوٹ مار او راپنے بھیڑ بکریوں کو چرا سکیں) اس وقت کے مکران میں بلوچوں کے سردار شہک جو کہ رند قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس کے ساتھ لاشار اور کچھ دیگر بلوچ قبائل مل کر قلات کی طرف نکل پڑے جس کی آمد کی خبر میرو کے بیٹھے عمر کو ہوئی (جو والد کے وفات کے بعد قلات کا حکمران تھا) اور وہ اس مقابلے کو تسلیم کرتے ہوئے جنگ کے لئے لشکر تیار کر کے قلات سے باہر نکلا اور رند و لاشار پر حملہ آور ہوا، اور بڑی گھمسان کی جنگ چلی اور بلآخر عمر مارا گیا اور یوں رند اور لاشاریوں کا قبضہ قلات پر ہو گیا۔ کچھ عرصے لوٹ مار اور حکومت کرنے کے بعد ان کو قلات کی سردی جو کے مکران کے نسبت کافی ٹھنڈا تھا کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے انھوں

نے کچھ ماہ بعد آگے کی جانب پیش قدمی کی کیونکہ وہ مال مویشی رکھنے والے قبائل تھے اوران کو مال مویشی چرانے قلات جیسا سرد علاقہ نا کافی لگا،اور شاید ایسی سردی انھوں نے کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی کیونکہ وہ مکران جیسے گرم علاقے کے باشندے تھے اس وقت کچھی میں جام نندہ کی حکومت تھی، جہاں جاموٹ ان کو آسانی سے جانے نہیں دیتے چونکہ ان بلوچوں کو بھی قلات کی سردی سے نجات حاصل کرنے اور مال مویشی چرانے کے لئے سردیوں میں کسی گرم علاقہ کی ضرورت تھی اور کچھی ایک وسیع اور دریائے بولان ومولا اور بھاگ کی وجہ سے سرسبز شاداب علاقہ تھا،اور سب سے بڑی بات یہاں دو قبیلے رند ولاشار علیحدہ علیحدہ با آسانی گزارا کر سکتے تھے،اور اپنے روایتی لوٹ مار والی عادت بھی کافی آسانی سے دہرا سکتے تھے کیونکہ کے سندھ کے زرخیز علاقہ جات ان کے قریب تھے۔ وہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کچھی پر حملہ آور ہوئے لاشاری دریائے مولا اور رند براستہ دریائے بولان سے کچھی پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح سردیوں کے آمد سے پہلے انہوں نے حملہ کی تیاریاں شروع کر دی،اور میر مندو کو جو میر چاکر کا سسر تھا، قلات میں بٹھا کر میر شیھک اور چاکر نے اپنے قبیلے کے ساتھ براستہ بولان اور میر گوہرام اور میر رامین نے اپنے قبیلے لاشار کے ساتھ براستہ مولا، کچھی پر دو طرفہ دھاوہ بول دیا۔ کچھ عرصے جنگ یونہی چلتی رہی اور چند سالوں میں مکمل طور پر جام نندہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے،اوپر کا علاقہ سنی شوران ،سیوی، ڈھاڈر، بھاگ،اور بارڑی رند قبیلے نے فتح کیا اور لاشار قبیلہ نے کوٹڑو، گاجان گنداوہ، جھل،اور کچھی کے تمام جنوبی حے پر قبضہ کر کے وہیں رہنے لگے۔ یوں دونوں قبائل الگ الگ اپنے علاقے میں رہنے لگے،اور یہیں سے کچھی میں بلوچ آبادی کی پہلی بنیاد پڑی جو بعد میں اس سے بھی زیادہ دور دور تک تب پھیل گئی جب رند ولاشار کے جنگ کا آغاز ایک گھوڑوں کے دوڑ کے بعد شروع ہونے والی جنگ سے ہوا کچھ نکل مکانی کر کے شکارپور تک جا پہنچے۔ لاشار کے دو بڑے قبائل آج بھی جسکانی سندھ میں آباد ہیں،اور دوسرا مگسی جو کہ گندھاوا میں آباد ہیں،اس جنگ سے آخر کار تنگ آ کر چاکر بھی پنجاب کی طرف ہجرت کر گیا۔ اس کے بعد سے یہاں بلوچ آباد ہیں اور آج بھی جمالی، عمرانی، کھوسو، مستوئی، منجو، ابڑو، گشکوری سبی میں ڈومبکی لہڑی میں اور غلام بولک سیوی میں آباد ہیں۔ کچھی میں آج تقریباً بہت سے قبائل رہتے ہیں جیسے کہ لہڑی، جتک، ساسولی، کہیری، پلال، جکھرانی بگٹی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان سب میں بڑی شاخیں جمالی، عمرانی، کھوسہ ہیں۔ عمرانی میر جلال خان کے ایک بیٹے علی کے ایک لڑکے عمر کی نسل ہے اور اسی نام سے چلے آرہے ہیں۔ کھوسہ جلال خان کے بیٹے ہوت کے نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جمالی کے بارے میں مقامی روایت ہے کہ وہ میر چاکر کے ساتھ اس علاقہ میں آئے تھے، غالباً ان سب کے رہن سہن دریائے کیرتھر اور پٹ فیڈر سے پہلے خانہ بدوشانہ تھا اور ریوڑوں کی پیداوار پر گزارہ کرتے تھے اور کسی حد تک غیر یقینی خشکابہ فصلوں پر ہوا کرتا تھا۔ اور انگریز مورخوں نے بھی اس کو بنجر اور چکنی مٹی کا بڑا تکلیف دہ خطہ قرار دیا تھا۔ ان کے علاوہ ڈومکی آج کے علاقے لہڑی میں رہتے ہیں (ان کا مستقل پڑاو یہاں پھر تب ہوا جب جنرل جان جیکب نے ان کو ایک معاہدے کے تحت جھکرانیوں کو ٹول جو کہ خان گڑھ (جیکب آباد) سے نزدیک ہے، وہاں کاشتکاری کے لئے زمینیں مختص کیئے اور ڈومکیوں کو لہڑی کا علاقہ دیا، کیونکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں مشہور لوٹ مار ہوا کرتے تھے دونوں قبائل نے اتنا ناک میں دم کر کے رکھا تھا کہ وائس رائے آف انڈیا نے خود احکامات جاری کیئے کے ان کا کوئی بندوبست ہونا چاہئے کیونکہ کچھی کا علاقہ وہ واحد علاقہ تھا جو افغانستان کو سندھ سے ملاتا تھا اور سارا کاروبار اسی رستے سے ہوا کرتا تھا جس کا فائدہ یہ دونوں قبائل اٹھایا کرتے تھا)۔ اسی طرح گشکوری (مکران گشکور سے آئے تھے اور یہ رند کے بیٹے رمضان کی نسل سے تھے اور گشکور کے بیٹے کے نام سے ان کو جانا جاتا ہے) اور مستوئی (جو کہ رند کے بیٹے رمضان کے نواسوں کی نسل سے شکل نامی کا بیٹا مستی خان سے بتایا جاتا ہے) اور سنی شوران رند گڑھ میں آج بھی رند قبیلہ آباد ہے جو کہ چاکر کے ساتھ یہاں آباد ہوئے اور غلام بولک سبی میں آباد ہوئے چانڈیو کا کہا جاتا کہ ان کے کچھ قبائل چاکر سے پہلے چانڈکو میں آ کر آباد ہوئے جو کے سندھ بلوچستان کے درمیانی جگہ کہلاتی تھی اور کچھ سبی میں بھی چاکر کے ساتھ آ کر آباد ہوئے۔ لاشاری زیادہ تر گنداواہ اور اس کے جنوبی حصوں میں آباد ہوئے تھے چنانچہ جب گھوڑوں کی دوڑ سے شروع ہونے والی رند لاشار جنگ شروع ہوئی تب لاشاریوں کو بری طریقے سے نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے بعد بھی مگسی آج بھی گنداوا میں آباد ہیں اور جسکانی سندھ جا کر آباد ہوئے نا صرف لاشاریوں نے سندھ کا رخ کیا بلکہ جمالیوں اور عمرانیوں نے بھی سندھ کا رخ کیا ہے اسی لیئے آج بھی سندھ میں وہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں ان سب کے علاوہ کچھ قبائل گوپانگ (جو کے سبی میں)، گولہ (نصیر آباد میں) اور منجو (منجوشوری میں) آباد ہیں جن میں گولہ اور گوپانگ چاکر کے ساتھ یہاں پر آئے، اور منجو، جو کے لاشاریوں کے ساتھ زیادہ قریب تھے آج بھی نواب مگسی کو اپنا سردار مانتے ہیں۔ یہ تو بلوچوں کی کچھی اور اس کے اردگرد کی تاریخ، زبان اور علاقائی صورت حال تھی، اب چلتے ہیں بلوچستان کی آزادی کے بعد کی حالات پر نظر دوڑاتے ہیں کہ، برطانیہ نے بلوچستان پر یکسر مختلف انداز سے حکمرانی کی کیونکہ باقی علاقوں کے نسبت بلوچستان بنجر علاقہ تھا اور یہاں حکمرانی کی نوعیت فوجی طرز کی تھی اسی لیئے باقی برصغیر کے نسبت یہاں معاشی ترقی کیلئے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے تھے، ان کا تعلق قبائلی عمائدین کے ساتھ تھا وہ ان کو وظیفہ دیا کرتے تھے اور اس کے عوض بلوچستان پر حکومت کیا کرتے تھے۔ اسلیئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کے قلات، مکران، خاران، اور لسبیلہ میں صرف ایک ہی اسکول تھا جو کے مستونگ میں قائم تھی۔ جب بلوچستان آزاد ہوا تب تک کالج کا نام ونشان بھی نہیں تھا، اور جب 27 مارچ 1948 کو بلوچستان پر قبضہ کیا گیا تب پاکستانیوں نے ایک سروے کے مطابق 1951 کے شرح خواندگی 19 فیصد تھی اور اس میں بلوچستان کے علاقے برٹش بلوچستان کے علاوہ ، پورے بلوچستان میں صرف 5 فیصد تھی۔ جب پاکستان نے اپنا قبضہ جما لیا تو انہوں نے بھی اسی طرح سرداروں کے ذریعے اس خطے کو سنبھالے رکھا، جس پر بلوچوں نے کئی بار آواز اٹھائی اور بدلے میں

فوجی آپریشن کے زد میں رہے۔ایسی حالت میں دریائے کیرتھر نے جمالیوں کے علاقوں کو آباد رکھا،لیکن باقی کچھی کا علاقہ بنجر اور خشک ہوا کرتا تھا، جب پٹ فیڈر کی نہر کا منصوبہ بنایا گیا تو اس پر نیب کی حکومت نے وہاں فوجیوں کو زمینوں کی الاٹمنٹ کے خلاف آواز اٹھائی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ پھر وہی ہوا جس کا ادراک ہمیشہ سے کیا جاتا تھا اور وہ 70 کے وسیع پیانے کا آپریشن تھا، دوسری جانب ہم دیکھیں تو بلوچستان ایک طویل عرصے سے ون یونٹ کا شکار رہا،ایک ہائی کورٹ ہوا کرتا تھا جو کراچی میں واقع تھا جہاں پر بلوچ جایا کرتے تھے،لیکن 70 کے بعد جب حکومت بنی تو اس کا حشر بھی سامنے ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا گیا۔اس دریا کے بعد ان دو ڈسٹرکوں میں وافر مقدار میں پانی دستیاب ہوئی جس سے یہاں کے بلوچوں کو فصل اگانے کا موقع ملا،اور یہ کوئی پاکستان کی عناعت بلوچوں پر نا تھی بلکہ قبضہ گیر پاکستان کے اپنے مفادات تھے، وہ یہاں اپنی فوج آباد کرنا چاہتے تھے اور پٹ فیڈر کو اسی لیئے بنانا چاہتے تھے لیکن انکے یہ مذموم مقاصد نیب کے اسوقت کے حکومت نے خاک میں ملا دیے، اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتے تو آج یہ نصیر آباد نہیں ہوتا جہاں بلوچوں کی آبادی پائی جاتی ہے ہوسکتا کہ وہ اقلیت میں پائے جاتے اور سارے جاگیردار پنجاب کے ہوتے، کچھی کے لوگوں کا تاریخی جھلک کے بعد آتے ہے آج کل کے لاشعوری بحث پر قابض ملک پاکستان نے جب بلوچستان کی آزادی ضبط کر کے یہاں اپنا قبضہ جمالیا تو اختیار وزمین کی ملکیت بلوچوں کے بجائے قابض کے ہاتھ میں آئے اسی لئے بلوچ کبھی من حیث القوم آپسی رابطے پیدا کر سکے اور نا ہی مشترکہ مفادات کی پرورش ہوئی۔طویل غلامی کی وجہ سے بلوچ معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حوالے سے جمود کا شکار ہو گئے اور آہستہ آہستہ ان علاقوں میں بلوچی زبان وثقافت، روایات اور اقدار ماند پڑنے لگے،سندھی اور سرائیکی کلچر یہاں فروغ پانے لگا، پاکستان کے پیدا کردہ جاگیرداروں اور سرداروں نے اپنے مفادات کے حفاظت کیلئے یہاں ایسے غلیظ روایات کی پرورش شروع کر دی جن کا بلوچ روشن خیال تہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔آج انہی علاقوں کی ثقافتی ولسانی صورتحال یہ ہے کہ بلوچ اپنے گھروں تک میں سندھی وسرائیکی بولنے لگے ہیں،لباس بدل چکے ہیں، دوسرے اقوام کے منفی اثرات جیسے کہ کاروکاری وغیرہ ان میں سرایت کرتی جارہی ہے۔یہاں پر کچھ ایسے عوامل کا ذکر کرونگا جو آج کل اس معاشرے میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے کچھ اہم عوامل تعصب، پیسے کی طلب، ذات پر فخر اور عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک سرفہرست ہیں۔کسی بھی معاشرے میں برائی یا جرم تب جنم لیتی ہے، جب ایک شخص انسانوں کے اس جم غفیر میں تنہارہ جاتا ہے تب ایک محرومی اور بیگانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سماج میں وجود کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں لگ جاتا ہے۔آج جب پیسے کے دم پر اپنی وجود کو قائم رکھنے کی روایت زندہ ہے اسی لئے ایک انسان تخلیقات کی جانب مائل با کرم ہونے کے بجائے ایک کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، معاشرے کے تمام اسبابوں سے ہٹ کر اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے اور الگ تھلگ اور کٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔جس کے بعد ایک بے حسی کا عالم پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے اور ایک پہچان وقبولیت حاصل کرنے کیلئے وہ ہمیشہ سب سے آگے پیسے اور صرف پیسے کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے اور ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے جو انسان کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے، انسان کے صلاحیت، تخلیقی سوچ وفکر تباہ ہو جاتا ہے، اسے اپنے اردگرد کے انسانوں کا کوئی فکر نہیں رہتا اور وہ اپنے آس پاس چیزوں کا موازنہ کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے جس سے صحیح اور غلط کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور ہر وقت کسی کا حق مار کر زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی جھد وجہد میں مصروف ہو جاتا ہے، اخلاقیات کے تمام تقدسوں کو پامال کر کے برائی کو معاشرے میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو ایک انسان کی اپنی بنائی ہوئی نظام میں وہ سماج میں اخلاقیات، اقدار اور روایات کے مطابق ناکامی کا لیبل لیے بیٹھ جاتا ہے اور مایوسی کو جنم دیتا ہے تو اس لیبل کو ختم کرنے کے لئے وہ طاقت حاصل کرنے کے لئے پیسہ اور دولت کو تقویت دیتا ہے کیونکہ ایسے سماج میں محبت، رشتے ناطے سب طاقت سے منسلک ہوتے ہیں اور وہ طاقت اسی پیسے اور رتبے کا نام ہے، اگر سماج میں بلند ہونا ہے تو دولت منداور بدعنوان ہونا ان کے لئے لازم وملزوم ہو جاتا ہے۔اس صورتحال کا سامنا ہمیشہ غلام معاشروں کو ہوتا ہے، جب قوم آزاد ہو اور اپنے قسمت پر اپنا اختیار ہو تو انسان تخلیقات کی جانب مائل ہوتا ہے اور اجتماعی سوچ کے تحت معاشرتی ترقی کو اپنا مطمع نظر بناتا ہے لیکن غلامی میں وہ اپنے قسمت کے اپنے زندگی تک پر اختیار کھو دیتا ہے اور قابض کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتا ہے تب اس معاشرے میں زندہ رہنے کیلئے انفرادیت کی سوچ جنم لیتی ہے جو ہمیں معاشرے سے کاٹ دیتا ہے اور یہی انفرادیت مذکورہ بالا منفی عوامل کی ماں ہے۔ ایسا ہی کچھ نصیر آباد اور جعفر آباد میں دیکھنے کو ملتا ہے، جب کھیرتھر اور پٹ فیڈر کا پانی یہاں پر آتا ہے تو اس کے بعد ایک ایسا ہی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے جہاں پیسے اور زمین، گاڑی رتبے کو اصل کامیابی اور مقصد سمجھا جانے لگتا ہے۔حالانکہ اس سے پہلے ان میں ایک بلوچ معاشرہ جہاں ریوڑوں پر گزارا بسر کیا جاتا تھا میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی اس کے بعد کمال کی تبدیلی آجاتی ہے اور یہاں کے لوگ دھن دولت کو اپنا زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہے، غالباً پوری دنیا میں بھی ایسا معاشرہ قائم ہے لیکن وہاں شعور وآگاہی بھائی چارہ یا سماجی حقوق کو ایک اہم پہلو سمجھا جاتا ہے وہاں ایک قابل اعتماد عدالتی نظام ہے، انصاف کے تمام تقاضے پورے کیئے جاتے ہیں مگر یہاں پاکستان قبضہ گیر نے اس سے الٹ کیا اور خاص طور پر بلوچستان کے ساتھ تو جنگل کا قانون نافذ کیا گیا یہاں صرف فوج کی بالادستی جو پنجاب کے تابع ہے اور فوج کی بالادستی کیلئے یہ نظام رائج کیا گیا کہ جو فوج کا دست راست ہوگا صرف انہی جاگیرداروں کا بول بالا ہوگا اور جب ایسا ہوا ،تب برائی، جس میں منشیات، چوری، قتل وغارت جیسے عوامل سرفہرست ہیں عام ہونے لگیں گے۔ آج ترقی و رتبے کیلئے بدعنوانی شرط اول بن چکی ہے جو جتنا بدعنوان ہوتا ہے وہ اتنا زیادہ اثر رکھتا ہے اور جو سب سے زیادہ بدعنوان ہوتا ہے وہی علاقے کا معتبرین میں شامل ہوتا ہے۔ زمینوں کے مالک ہو کر بھی سود اور قرضوں میں ڈوبے ہوتے ہیں، کیونکہ منشیات کے عادی ہو چکے ہیں۔آدھے سے زیادہ پیسہ دکھاوے کے لیے خرچ کیا جاتا ہے، تاکہ معاشرے

میں برابری کیا جاسکے اچھی گاڑی ہو، اچھا گھر ہو، یا نہ ہو اوتاک اچھا ہو، اور جو کچھ کمایا جاتا ہے وہ عیاشی میں جیکب آباد اور لاڑکانہ میں اڑایا جاتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ایک منصوبے کے ساتھ اس علاقے کے لوگوں کو ایک ایسے خاص ماحول میں الجھایا جارہا ہے کہ ان کی سوچ اپنے گھر کے مثائل سے زیادہ میر معتبرین، جاگیرداروں کے رہن سہن اور ان کے حرکتوں کو بحث میں لانا ہی مقصود بنائی جارہی ہے اور جہاں الیکشن میں اتنا دلچسپی لینا کہ جیسے یہ لیڈران کے لئے کچھ کرسکتے ہونگے پلید پاکستانی سیاست کے طرز میں کبھی ترقی پوشیدہ نہیں ہوتی بس ہر الیکشن میں کوئی جاگیردار و نام نہاد معتبر کوئی نا کوئی تعصب پھیلا کر ووٹوں کیلئے لوگوں کو آپس میں لڑا کر پارلیمنٹ میں پہنچتا ہے کبھی براہوی بلوچ کا تنازعہ کھڑا کرکے ووٹ بٹورا جاتا ہے تو کبھی ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے سامنے کھڑا کرکے ایک تنازعہ کھڑا کیا جاتا ہے تاکہ اپنے ہم قبیلہ والوں کیلئے مقابل قبیلے سے ایک ڈر اور خوف پیدا کرکے ان کو اپنی طرف بلایا جائے اور ووٹ سمیٹا جائے، کبھی پانی کا تنازعہ کبھی غیرت کی جنگ کبھی زمینوں کے جھگڑے تو کبھی خاندانی رنجشوں کو بنیاد بنا کر عام غریب بلوچوں کو ایک رکنے والے تعصب اور لڑائی دھکیل دیا جاتا ہے جن سے انکے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر غلامی کے احساس، معاشرے میں برابری کے خواہش سے نکل کر محض تعصبات کے گرد گھومتی ہے اور اسکے بدلے ایک طرف یہ نام نہاد جاگیردار و معتبرین پارلیمنٹوں میں سیٹیں بناتے ہیں، جاگیریں بڑھاتے ہیں اور انکے ذریعے پاکستان بلوچوں کو آپسی رنجشوں میں اس قدر الجھا دیتا ہے کہ کوئی اپنے ذات، برادری اور قبیلے سے باہر نکل کر قومی حیثیت سے سوچنا چھوڑ دیتا ہے اور جب وہ قومی سوچ کو چھوڑ دیتا ہے تو غلامی سے سمجھوتا کر دیتا ہے پھر اسکی زندگی کا محور کبھی کسی میر کی تابعداری، کبھی جاگیردار کی تابعداری کبھی کسی سائیں کی تابعداری بن جاتی ہے، وہ اس احساس سے دور ہو جاتا ہے کہ میں بھی ایک برابر انسان اور ایک برابر بلوچ ہوں میں کیونکر اس معاشرے میں محض تعصب اور فساد میں اپنی زندگی گزاروں کیوں اپنے طرح کے ایک انسان کو جاگیردار و معتبر بنا کر اسکی غلامی کروں میں کیوں برابری اور خوشحالی کے ساتھ آزاد زندگی نا گذاروں۔ پرکھوں کی کہاوت ہے کہ تمام جھگڑوں اور تنازعات کی وجہ ''زر، زن اور زمین'' ہیں۔ جیسا کہ کہاوت سے واضح ہے کہ مال اور زمین کی طرح اس سماج میں عورت کو بھی جنس اور ذاتی ملکیت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ عنصر واضح طور پر عیاں ہے ہمارے معاشرے میں، جس میں عورت کو ذاتی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور اس کے تمام حقوق کو رد کیا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں ماں غلام ہو وہاں کا پورا معاشرہ غلامانہ سوچ کا حامل ہوتا ہے اور یہی کچھ نصیر آباد و جعفر آباد میں بھی دیکھنے کو ملے گا، یہاں میں یہ نہیں کہونگا کہ اس فرسودہ سوچ کا تعلق محض ایک طبقے سے ہے بلکہ کوئی بھی اس سے بری الزمہ نہیں۔ یہاں غریب طبقے کے خواتین، جو سخت موسم میں گندم کی کٹائی، چاول کی چنائی اور فصل کی بوائی جیسی اذیت ناک مشقت کرتی ہے۔ شب و روز مسلسل جسمانی مشقت کرنے والی یہ خواتین ''اخلاقیات'' کے ٹھیکے دار جس میں شوہر سے لے کر بھائی بیٹا یا باپ کے فرسودہ معیاروں پر پورا اتر ہی نہیں سکتیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر پھرتی ہے۔ درمیانے طبقے کے مرد حضرات امیروں سے متاثر ہوکر تمام کی تمام معاشی اخراجات، گاڑی و کاٹن سوٹ پر خرچ کر بیٹھتے ہیں اور یہی نہیں باقی جو پیسہ آتا ہے وہ منشیات کے نظر کر دیتے ہیں ایسے میں گھر میں ماں اور بہنیں بیوی کس حال میں جی رہے ہوتے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا کچھ ایسے گھرانے بھی ریکارڈ پر ہیں کے جن کو سال میں صرف دو بار خریداری کا حق ہوتا ہے اور وہ پورے سال دو جوڑے عید کا بامشکل سستے داموں لے کر پورا سال گزارتی ہیں۔ اسی طرح امیروں میں جو بڑے جاگیرداروں کی خواتین ہوتی ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے مرد پورا پورا دن کہیں اور گزارتے ہیں گھر کا حال کیا ہے اس پر کوئی توجہ مرکوز نہیں کرتے ہیں، اور نشے میں دھت رہنے ولے یہ امیروں کے اولاد بھی ان سے متاثر ہو کر غلط روش پر چل پڑتے ہیں، جو زیادہ تر بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں وہاں ان کے لئے ایک نیا ماحول ہوتا ہے اور وہ خاوند کے غفلت اور غیر زمہ داری سے مجبور ہو کر معاشرے کا ایک بھیانک چہرہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عورت کے حقوق کا کوئی خیال نا رکھنے پر غریب ماں یا بیٹی ذمیندار کا شکار رہتا ہے، درمیانے طبقے والے چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل کرنے کے عوض معاشرے کے بدکار اور عیاش لڑکوں کے ہات لگ جاتے ہیں اور جو پیسے والے ہوتی ہیں ان کا تو کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو کاروکاری ایک ایسا روایتی اور فرسودہ قانون ہے کہ جس میں موقع پرست بخوبی فائدہ اٹھاسکتے ہیں، چونکہ اوپر بیان کر چکا ہوں کے نشہ اور جوئے کے عادی لوگ ہمیشہ قرض اور سود کے ایک ایسے جال میں پھنس جاتے ہیں جن سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے، اور ایسے میں جب حدِ تجاوز قرض کا بڑھ جاتا ہے تو قرض کی ادائیگی کے بہانے ان کو گھر بلا کر کاروکاری کا بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، یعنی اب یہ روایت عام ہے کہ اگر کسی پر کوئی قرض ہو، یا کسی شخص کا کسی اور سے کوئی ذاتی مسئلہ ہو یا پھر کوئی بھی اور رنجش وہ اس شخص کو قتل کر کے گھر آکر اپنے ماں، بہن، بیوی یا بیٹی تک کو قتل کر دیتا ہے اور بعد میں غیرت کا چمپین بن کر اسے کاروکاری کا نام دے کر کسی بھی سزا سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ بعض واقعات میں ایسا بھی ہوا ہے کہ عورت نماز پر بیٹھی دعا میں مصروف ہوتی ہے اور بھائی اپنے قرض کا کفارہ ادا کرنے کیلئے بہن یا بیوی کو دوران نماز ہی قتل کر کے کاروکاری کا الزام دھر دیتے ہیں۔ ریاست پاکستان ان عوامل کو پھر بطور ہتھکنڈا استعمال کرتے ہوئے بلوچوں کو جاہل اور وحشی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دنیا میں بلوچوں کی بات اور پکار کبھی سنا نا جاسکے۔ کاروکاری کے قانون میں جس طرح یہاں عورت کو نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے اتنی ہی کم ہے جس طرح میں عرض کر چکا ہوں کہ سب سے پہلے پٹ فیڈر اور فوجیوں کو مختص شدہ زمینوں پر ثابت قدم نیپ کے زمانے میں بلوچ رہنماؤں نے آواز اٹھائی اس طرح شاید آج تک ان علاقے کے لیڈران نے بھی نہیں اٹھایا ہوگا، یہاں کے لیڈر حضرات نے بلوچوں کو ایسے سمجھا بجھا کے رکھا ہوا ہے کہ جیسے یہ تحریک بگٹیوں اور مریوں کا ہے اور جب بلوچستان آزاد ہوا تو وہ آپ کے زمینوں کو قبضہ کرینگے کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی ذرخیز

زمین نہیں جہاں پانی دستیاب ہو، اور وہ سب سے پہلے اس خطہ پر زبردستی قابض ہو جائینگے حالانکہ یہ باتیں محض جھوٹ اور لغویات ہیں بلوچ قومی آزادی میں پوری بلوچ قوم کی ترقی، خوشحالی، آزادی اور برابری پوشیدہ ہے، ذرا سوچیں کے آج ان علاقوں میں جمالی، کھوسہ اور عمرانی کے میر اور جاگیردار طبقے کے علاوہ کونسا بلوچ خوشحالی اور آسودگی کی زندگی گذار رہا ہے؟ یہی جاگیردار ہیں، مالک ہے اور وزیر بھی اور باقی سب بلوچ انکے رعایا کی طرح بن چکے ہیں، اب یہ اپنی یہ حکمرانی چلائے رکھنے کیلئے ایسا ماحول بنا رہے ہیں کہ ایک عام بلوچ کبھی اپنے حق اور آزادی کیلئے آواز نا اٹھائے ہمیشہ اپنے بلوچوں کو کبھی برادری کے نام پر کبھی قبیلے کے نام پر اور کبھی زبان کے نام پر اپنا دشمن سمجھتے رہیں اور کبھی ان حقیقی دشمنوں کے خلاف کھڑے نہیں ہو جائیں جو قابض ملک پاکستان اور اسکے بنائے گئے سردار و جاگیرداروں کی صورت میں سالوں سے عام بلوچوں کو غلامی اور بدحالی کے دلدلوں میں دھکیل رہے ہیں، صادق عمرانی جیسے لوگ عام بلوچوں کو ایسے ہی جھگڑوں میں پھنسا کر غلامی اور اپنے مفادات کا رستہ صاف کر رہے ہیں لوگ اپنے حالات سے بے خبر بس ان وڈیروں سے معمولی معمولی مراعات یا نوکریاں حاصل کرنے کیلئے ان کیلئے غلاموں کی طرح بجا آوری کرتے ہیں اور ایک بڑے حد تک یہ لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں جس میں الیکشن میں عوام کا جوش و خروش سے حصہ لینا ہے خاص کر اوستہ محمد کے عوام ہر بار اسی خاندان کو جیتنے کے لیئے ووٹ دیتے ہیں ان کی بجا آوری کرتے ہیں لیکن کبھی انکی اپنی حالت زار نہیں بدلتی اور ایسے ریاستی گماشتے روز بروز امیر اور طاقتور ہوتے جاتے ہیں بعد میں یہی طاقت وہ انہی بلوچوں کو دبانے اور اپنی غلامی کرانے کیلئے استعمال کرتے ہیں، ویسے ان سے ایک سوال ہے کہ اتنا عرصہ وزیر اور پاکستان کے چمچہ گزاری میں رہنے والے کچھ جاگیردار آج تک استہ محمد میں کیوں خاطر خواہ ترقی نہ دے سکے؟ کیونکہ غلامی میں کبھی ترقی نہیں ہوتی اور نا ہی ایسے ریاستی گماشتوں یا ریاست کا مقصد لوگوں کو ترقی دینا ہوتا ہے انکا مقصد غلام پیدا کر کے انہیں بس اتنا مہیا کرنا ہوتا ہے جس سے وہ اپنی شب و روز گذار سکیں اور مزید تابعداری کر سکیں، یہ ایک غلط تاثر بنایا گیا ہے کہ جمالیوں کو ہرانہ مشکل ہے کونسی بازی اور کون سا ہرانہ کس لئے ہرانا، یہ تو ایک ایسی بات ہوئی کہ ایک نوکر دوسرے نوکر کی جی حضوری کے لئے زیادہ سے زیادہ محوِ دستگیری کرتا پرتا ہو، جس کی واضح مثال یہ ہے کہ ان کو ریاست پاکستان نے وزیر اعظم بھی بنایا تب بھی استہ محمد کا حالت نہیں بدل سکے تو آگے کیا بدلینگے۔ آپ ووٹ چاہے دو یا نہ دو ریاست ہمیشہ اپنے من پسند لوگوں کو وزارت دیا کرے گی اور آپ کو زندگی کے بنیادی ضروریات سے ہمیشہ محروم رکھے گی، ان سب سے بہترین حل یہی ہے کہ اس ریاست کے اس چال جس میں "ہاتھی کے دیکھانے کے دانت اور کھانے کے اور" والی پالیسیوں سے یکسر بائکاٹ کر کے شعور و آگاہی کا سبق حاصل کریں، عوام کو ایک پختہ سوچ کا حامل بنا دیں اور ان کو بتایں کے بلوچ عوام جس پر بزور طاقت فوج نے 27 مارچ 1948 پر قبضہ کیا تھا ہمیں اس قبضے کو چھڑانا ہے، یقیناً بیان کردہ معاشرتی برائیاں ایک جمعی تجزیہ ہے آج بھی ان بلوچ علاقوں میں باشعور بلوچوں کی کمی نہیں، اس صورتحال کو بیان کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہم ایک بار اپنے اردگرد دیکھ کر حالت زار کا مشاہدہ کریں اور خود سے یہ سوال پوچھیں کے، ہماری حالت کیوں ابتر ہے؟ ہمارے زندگی کا معیار وہ کیوں نہیں جو یورپ اور امریکہ میں بسے میرے جیسے ایک انسان کا ہے؟ میرے اردگرد میں ایک بھی معیاری ہسپتال یا اسکول کیوں نہیں؟ پورے کچھی میں ایک یونیورسٹی کیوں نہیں؟ ہمارا معاشرے میں سب کا مقصد محض بجا آوری کرنا کیوں بن گیا ہے اور دوسری طرف یہ کچھ بااثر خاندان ہی یہاں ہر نظم و نسق کا مالک کیوں ہیں؟ وہی خاندان وڈیرے بھی ہیں، وزیر بھی ہیں اور منصف بھی ہیں اور طاقت بھی آخر کیوں؟ سالوں سے پاکستانی نظام میں رہ کر اسکے نظام کے تحت ووٹ ڈال کر الیکشنوں پر لڑ جھگڑ کر کسی وڈیرے کو پارلیمنٹ میں بٹھاتے ہیں لیکن میری زندگی بہتر کے بجائے کیوں ابتر ہوتی جارہی ہے اور انکی زندگی کیوں روز بروز سنور رہی ہے؟ صرف یہی نہیں بلکہ جو حالت میری ہے وہی حالات آکر سار اوان، جھلاوان، خاران اور مکران کے بلوچوں کا بھی کیوں ہے؟ اس کیوں کی تلاش میں جب نکلیں گے تو ایک ہی جواب ملے گا کہ پوری دنیا کے تمام ملکوں کو دیکھیں جہاں ہمارے جیسے عام انسانوں کو عزت، برابری، ترقی، خوشحالی اور آزادی حاصل ہے اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے کسی مسیحا کا انتظار نہیں کیا وہ اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے سب سے پہلے خود کو قابض سے آزاد کیا، اپنے ملک کے مالک خود بن گئے، پھر حقیقی جمہوریت قائم کی ایسے خود ساختہ وڈیروں اور نوابوں کو صفایا کیا اور ہر انسان کو برابر کر دیا، جب اپنی ریاست بنی تو سارے وسائل بھی اپنے ہاتھوں میں آ گئے انصاف کے ساتھ سب لوگوں کے تعلیم ترقی اور صحت پر خرچ ہونے لگے۔ آج ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں صرف غلامی ہے سب پہلے پاکستان نے ہم پر قبضہ کر کے ہمیں اپنا غلام بنایا پھر اپنے بنائے ہوئے نوابوں، سرداروں اور وڈیروں کے ذریعے ہم پر تسلط قائم کی آج ہمیں سب سے پہلے پاکستان کے غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہوگا اسکے خاتمے کے ساتھ ہی اسکے بنائے گئے یہ کٹھ پتلی وڈیرہ شاہی خود ہی ختم ہو جائے گی اور ہم بھی ایک آزادی اور ترقی یافتہ انسان کی حیثیت سے ایک آزادی بلوچ معاشرے میں سانس لیں گے جہاں ہمیں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر نہیں ہوگی بلکہ ہم دنیا کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے آج نان شبینہ کے بجائے چاند پر کمندیں ڈالنے کا سوچیں گے۔

ریفرنس:

1: (تاریخ بلوچستان ء (۔۔۔۔۔ نصیر خان، ایڈوکیٹ خدا بخش، اور لالا ہوت رام)

2: (قدیم بلوچستان)

دوران تحریک مشترکہ مقاصد رکھنے کے باوجود پھوٹ وتقسیم نہ کوئی انہونی عمل ہے اور نہ ہی حیران کن!

مغالطے ومفروضات

___ نود بندگ بلوچ

دوران تحریک مشترکہ مقاصد رکھنے کے باوجود پھوٹ وتقسیم نا کوئی انہونی عمل ہے اور نا ہی حیران کن، جدید تحریکوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہی ہمیں ایسے کئی مثال مل سکتے ہیں، لیکن اس امر کا ادراک کہ آیا یہ پھوٹ مثبت نتائج کا حامل ہوگا یا اسکے اثرات منفی مرتب ہونگے یقیناً پیچیدگیوں کا حامل ہے اور بادی النظر میں اسکا اندازہ لگانا قطعی آسان نہیں، یقیناً کوئی معنی خیز نتیجہ اخذ کرنا یہاں تناظر و محرکات پر غور کرنے کا متقاضی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اگر اس وقت نیشنل پارٹی کے اندر ایک گروہ آزادی کی حمایت کرتے ہوئے اختلاف رکھے اور نیشنل پارٹی پر تنقید کرے، اسے تقسیم کر کے ایک نئی آزادی پسند پارٹی بنائے تو پھر یہ عمل سرسری جائزے سے پھوٹ اور تقسیم ہی کہلائے گا لیکن قومی مفادات کے تناظر میں ہم اس پھوٹ کو خوش آئیند اور مثبت ہی کہیں گے وہیں یہی عمل نیشنل پارٹی کے گروہی وتنظیمی مفادات کے تحت ایک منفی و نقصاندہ نتائج کے حامل عمل ہوگا، اس مثال کو ہم آسانی سے اسلیئے جذب اور تسلیم کر پاتے ہیں کیونکہ یہاں ہمارے پاس اس پھوٹ کو جانچنے کا ایک بااعتبار پیمانہ ''قومی مفادات'' موجود ہے، اسی لئے ہم اس مسئلے کو قومی مفادات کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں۔ایک پیمانے کے بعد اسکے پیچھے چھپے محرکات پر بھی غور کرنا ضروری ہے تاکہ اخذ شدہ پیمانے کے ساتھ انصاف ہوسکے، محرکات میں وہ مخصوص معروضی حقائق شامل ہوتے ہیں جو کسی مخصوص وقت میں سیاست کے تقاضوں میں شامل ہو اور اس پر اثر انداز ہوتا ہو یعنی اگر نیشنل پارٹی میں پھوٹ قومی مفادات کے تحت مثبت عمل ہے تو پھر اس کے پیچھے محرکات میں موجودہ قومی تحریک آزادی ہے جو اس پیمانے کو جواز فراہم کرتا ہے، مثال کے طور پر بلوچ لبریشن آرمی میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور ایک گروہ یونائیٹڈ بلوچ آرمی کے نام سے قومی مفادات کو جواز بنا کر الگ ہوتی ہے لیکن یہاں محرکات پر اگر غور کریں تو ''قومی مفادات'' کے پیمانے سے انصاف نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ یہاں حقیقی محرکات ذاتی فوائد اور فرار ہیں۔یقیناً محرکات کا تعین بھی تحقیق کا محتاج ہے۔ایک عمل کے بابت تحقیق کر کے محرکات کو پہچاننا پھر اسے متعین شدہ پیمانے ''قومی مفادات'' کے تناظر میں پرکھ کر ہم اس کے مقاصد کا آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں اور مقاصد کی سادہ سی جانچ ہم پر اسکے منفی ومثبت اثرات یا نتائج عیاں کرتی ہے یہ میکانیہ نا مجرد ہے اور نا ہی قطعی لیکن مسائل کو سمجھنے میں ضرور مددگار ثابت ہوسکتی ہے اسی لیئے یہ محض پھوٹ وتقسیم پر ہی موقوف نہیں بلکہ اختلافات کی قلعی بھی اس میکانیہ پر کھل سکتی ہے۔بلوچ قومی سیاست میں اختلافات کا وجود اب راز نہیں رہے۔ان اختلافات کو گر مختصراً بیان کیا جائے تو وہ روایتی انفرادیت پسند، گروہ پرست سیاست سے نکل کر قومی مفادات کو مقدم جان کر انہیں اپنا مطمع نظر مان کر جدوجہد کرنا ہے۔ایک سادہ سی تحقیق سے اس کے محرکات اخذ کرنا بھی مشکل نہیں۔بی ایل اے کے ہوتے ہوئے مختلف پلیٹ فارم تشکیل دیکر جدا جدا حیثیت سے لڑنا، بی این ایم و بی ایس او کے ہوتے ہوئے بی آر پی و بی آر ایس او کا قیام، بی این ایف کو توڑنا، یو بی اے کا بننا اور اسکے بننے کو روکنے کے بجائے بی ایل ایف و بی آر اے کا اس سے گروہی فوائد کا حصول، بلوچستان لبریشن چارٹر کو مسترد کر کے اپنے اپنے پارٹی منشوروں پر اکتفاء کرنا وغیرہ اسکے چیدہ چیدہ محرکات میں شامل ہیں، یہ تمام محرکات گروہیت پرستی، ذاتی مفادات کے حصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اب اختلافات کی نوعیت کو دیکھیں تو وہ بھی اسی چیز کا تقاضہ کرتے ہیں کہ اس منفی روایتی سیاست اور گروہیت سے نکل کر قومی دھارے کو مطمع نظر بنایا جائے، اگر قومی مفادات کے تناظر میں ان اختلافات کا جائزہ لیں تو ہم بلاتوقف یہ کہہ سکتے ہیں کہ قومی آزادی کیلئے قومی دھارہ گروہیت سے زیادہ مقدم ہے اور قدیم و روایتی کے مقابلے میں جدید زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس سادہ سے جانچ سے اب ان اختلافات کے مقاصد بھی ہمارے سامنے عیاں ہیں کہ وہ قومی تحریک کو روایتی و گروہی سیاست سے نکال کر جدید و قومی دھارے کے بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں، اس نتیجے کے بنیاد پر ہم بلاشک اخذ کرسکتے ہیں کہ ان اختلافات کے نتائج و اثرات مثبت ہی ہونگے۔میرے خیال میں کوئی بھی صحتمند ذہن ان اختلافات کو نا صرف جذب کرسکتا ہے بلکہ تسلیم بھی کرسکتا ہے۔لیکن وہ طبقہ ہائے فکر جو موجودہ طریق سے انفرادی و گروہی فوائد اٹھانا چاہتی ہے، شروع سے ہی یہ کوشش کرتی رہی ہے کہ ان اختلافات کے بابت مبہم مفروضات گھڑ کر مغالطے پیدا کیئے

جائیں اور عوام میں اسکے بھیانک انجام کا منفی پروپگینڈہ کر کے اختلاف رکھنے والے اور اس کے اظہار کے طریقے کو متنازعہ بنایا جائے۔ان مفروضات کو گھڑنے کے پیچھے اپنے منفی عزائم (جو اختلاف کے موجب ہیں) کے اوپر انقلاب کی ملمع سازی کر کے انہیں چھپانے کی سعی ہے، لیکن اپنے منفی کردار کو چھپانے کیلئے جو بھیانک منظر کشی کی جارہی ہے اس سے وہ ایک اور منفی عمل ''عوامی مایوسی پھیلانے'' کا بھی موجب بن رہے ہیں۔اگر غور کیا جائے ابتداء میں جن سے اختلاف رکھا جارہا تھا (بی این ایم، بی ایس او، بی ایل ایف، بی آر پی) انکی یہی کوشش رہی تھی کہ کسی طور یہ حقائق عوام کے سامنے نا آپائیں اسلئے وہ اختلافات کے اظہار کے ذریعے (سوشل میڈیا) کو متنازعہ بنانے کی کوشش کرتے رہے اور اختلافات کے وجود سے ہی انکار کردیا، حتیٰ کے میڈیا میں مخالفین (حیربیار و ہم فکر) کے بابت ایک بار بھی یہ ظاھر نہیں کیا کہ ان سے کوئی اختلاف ہے، لیکن ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کو روکنے کیلئے کارکنان کے ذریعے گالم گلوچ، اپنے پارٹیوں سے سوشل میڈیا کے خلاف فتویٰ جات، اور اظہار کرنے والوں کو غداری کے سرٹیفکٹ بانٹنے کا بازار گرم رہا لیکن جب ایک بار اختلافات طشت از بام ہو گئے اسکے بعد سوشل میڈیا مزید مسئلہ نہیں رہا سی بی ایس او نے ان اختلافات پر سوشل میڈیا میں لکھنے کا اعلان کردیا، بی این ایم آرٹیکل شائع کرنے لگا اور ڈاکٹر اللہ نظر بذات خود سوشل ویب سائٹ ٹویٹر پر اکاونٹ کھول کر حیربیار پر کئی دفعہ تنقید کرنے لگے یعنی جو عمل حرام تھا اچانک انکے ہاتھوں آکر حلال ہو گیا اس سے ظاھر ہوتا ہے کہ سوشل میڈیا کبھی بھی مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسئلہ ہمیشہ سے یہ رہا تھا کہ ان اختلافات کی نوعیت کو کبھی بھی عوام کے سامنے ظاھر نہیں کیا جائے کیونکہ انکی نوعیت کے سامنے آنے سے انکی گروہی و مفاداتی سیاست کی پول کھلتی اور انکی ساکھ متاثر ہوتی۔جب ایک دفعہ سب کچھ ظاھر ہو گیا تو پھر ڈاکٹر اللہ نظر اور بی این ایف اپنے پرانے موقف کو یکسر بھول کر مخالفین (حیربیار و ہمفکروں) پر الزام تراشی کرنے لگے اور اپنی دستیاب قوت (انکے اختیار میں پارٹیوں) کو استعمال کرتے ہوئے، ان پارٹیوں اور تنظیموں کے ناموں سے ایسے من گھڑت بیانات جاری کرنے لگے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا، جن کا مقصد محض مخالفین کو متنازعہ بنانا تھا۔اس دوران اختلافات کے مقاصد کو منفی پیش کرنے اور مخالفین کو متنازعہ بنانے اور ساتھ میں جھوٹ کی ملمع سازی کر کے اسکے پیچھے چھپنے کیلئے ہر وقت نت نئے مفروضات سامنے لائے گئے اور مغالطے پیدا کیئے گئے۔ان زبان زد عام مغالطوں و مفروضات کی تشریح لازم جان کر میں ان میں سے چیدہ چیدہ کی تشریح کرنا چاہوں گا تا کہ پھیلائے گئے ابہام کو رفع کیا جاسکے

☆۔ اداروں میں مداخلت

ان اختلافات کو لیکر جب سے سنگت حیربیار مری اور اسکے ہم فکروں کی جانب سے برملا تنقید کا آغاز ہوا اس وقت سے ایک مفروضہ قائم کیا جارہا ہے کہ ''یہ تنقید ان اداروں کے داخلی امور میں مداخلت ہے''۔ایک طرف دیکھا جائے تو یہ مفروضہ بھی مغالطے پیدا کرنے کی سعی ہے لیکن دوسری طرف دراصل یہ انکے گروہی سوچ کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔موجودہ قومی تحریک کا جب آغاز ہوا تو اس وقت نا بی ایس او اور بی این ایم وجود رکھتے تھے نا ہی بی آر پی اور بی آر ایس او اور نا ہی بی ایل اے کے سوا کوئی مسلح تنظیم یعنی تحریک نے ان تنظیموں کو پیدا کیا ان تنظیموں نے تحریک کو پیدا نہیں کیا اور نا ہی تحریک ان تنظیموں کے وجود یا نام کا مرہونِ منت ہے، تحریک ایک مقصد کیلئے ہے اور یہ تنظیمیں اس مقصد تک پہنچنے کے مختلف ذرائع اب مقصد کے خاطر وقت و حالات کے مطابق ذرائع تو تبدیل کی جاسکتی ہیں لیکن ذرائع کے خاطر مقصد تبدیل نہیں کی جاسکتی اگر تبدیل کی گئی تو ان ذرائع کا بھی جواز ختم ہوجاتا ہے مطلب یہ کہ ان ذرائع کے سامنے مقصد کئی گنا زیادہ مقدم، محترم اور اہمیت کا حامل ہے جس کی خاطر ذرائع کو کبھی بھی قربان یا تبدیل کی جاسکتی ہے پھر یہاں مداخلت کا مفروضہ اپنی حیثیت کھودیتا ہے کیونکہ قومی مفادات آپ کو یہ جواز فراہم کرتے ہیں کہ آپ کسی بھی گروہ کے اعمال و افعال کو احتساب کے کٹھرے میں لاسکتے ہیں، جہاں مقصد قومی آزادی کی خاطر ذرائع تنظیم کو قربان یا تبدیل تک کی جاسکتی ہو وہاں اگر انہی قومی مفادات کے تحت کسی بھی تنظیم کے داخلی امور میں مداخلت نا کوئی بڑی بات ہے اور نا ہی عمل مانع۔ یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کسی ادارے کے اندرونی معاملات میں آخر مداخلت کیوں کی جائے؟ بلوچ قومی تحریک آزادی میں اس وقت درجن بھر سے زائد قابلِ ذکر عسکری و غیر عسکری تنظیمیں وجود رکھتے ہیں ان سب کا مقصد قومی آزادی ہے اور حصول کا میکانیہ بلوچ عوام کو مائل و قائل کر کے متوجہ کرنا اور اس تحریک میں زیادہ سے زیادہ شامل کرنا اور اسکی طاقت سے قابض کو اپنے زمین سے بیدخل کرنا ہے یعنی سب میں بہت سارے تضادات اور ہیت میں تنوع ہونے کے باوجود قومی آزادی اور بلوچ عوام دو مشترکہ چیزیں ہیں، اسی لیئے اگر کوئی بھی تنظیم قومی آزادی کے بابت کوئی مثبت کام کرتا ہے یا بلوچ عوام میں شعوری بیداری کیلئے کوئی اچھا قدم اٹھاتا ہے تو اسکے اثرات باقی تمام کے تمام تنظیموں اور قومی مفادات پر مثبت پڑتے ہیں لیکن اسی طرح اگر کوئی بھی ایک تنظیم کوئی ایسا کام کرے جس سے عوامی حمایت کو نقصان پہنچے یا قومی مقصد آزادی کے حوالے سے عالمی یا علاقائی سطح پر ہزیمت اٹھانا پڑے تو پھر اسکے منفی اثرات بھی تمام تنظیموں اور قومی مفادات پر منفی پڑتے ہیں۔جب ایسے عوامل تواتر سے ہونے لگیں جس سے قومی مفادات و مقصد اور عوامی حمایت کو مسلسل نقصان مل رہا ہو تو پھر ان عوامل کو روکنا انتہائی ضروری ہوجاتا ہے، اب روکنے کیلئے مذاکرات ہوسکتے ہیں جیسے کہ بی ایل اے کے نمائندے بابا خیر بخش مری اور ڈاکٹر اللہ نظر و دیگر سے کئی بار اس بابت ملاقاتیں کرتے رہے، روکنے کیلئے نقصاندہ تنظیموں کی داخلی معاملات میں مداخلت کر کے تنقید بھی کی جاسکتی ہے جیسے کہ گذشتہ ایک عرصے سے حیربیار مری سے فکری طور پر منسلک لوگ سوشل و پرنٹ میڈیا میں کررہے ہیں تا کہ عوام کو ان منفی اعمال سے آگاہ کر کے انکے دباو سے ان تنظیموں کو روکا جائے، اب کیونکہ کسی تنظیم کا وجود ہی

قومی مقصد کیلئے ہوتا ہے اور اگر قومی مقصد کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہو تو پھر روکنے کیلئے وقت و حالات کے مطابق آخری حد طاقت کے استعمال تک بھی جا سکتے ہیں جیسا کہ یو بی اے کے خلاف بلوچ لبریشن آرمی طاقت کا استعمال کر رہا ہے، طاقت کا استعمال ناگزیر صورت میں ہی کی جاتی ہے کیونکہ اگر قومی مقصد کو ہی ناکام بنا دیا گیا تو پھر کسی بھی تنظیم یا ہمارے صورتحال میں بی ایل اے کے اپنے وجود کا کیا فائدہ۔ آج اگر بی ایل اے مسلح محاذ پر بندوق سے اور حیربیار مری سے فکری طور پر منسلک لوگ اپنے تحریروں و تقریروں میں باقی ماندہ تنظیموں کے سامنے اکیلے کھڑا ہو کر ان کے داخلی امور میں مداخلت کر رہے ہیں تو یہ ایک بہت بڑا اقدم ہے، اسکے نتیجے میں ایک طرف بی ایل اے کو باقی سب کے مشترکہ عسکری قوت کے خطرے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے تو دوسری طرف باقی تمام پارٹیوں کے منفی پروپگینڈوں اور پھیلائے گئے مفروضات و مبالغوں سے حیربیار کے فکری دوستوں کو متنازعہ ہونے و تنہائی کا بھی سامنا ہو سکتا ہے، لیکن قومی مقصد و مفادات کے آگے نا بی ایل اے کا وجود اہمیت رکھتا ہے اور نا ہی کوئی خوشنامی، اگر یہ سب ختم ہو جاتے ہیں لیکن قومی تحریک سلامت رہتی ہے تو یہ مہنگا سودا نہیں کیونکہ پھر کوئی نا کوئی کہیں نا کہیں سے اٹھ کر اس کاروان کو آگے بڑھائے گا لیکن اگر تحریک ختم ہو جاتی ہے تو پھر بی ایل اے سمیت باقی سب کا وجود و نام کسی کام کا نہیں

☆۔ اپنا اپنا چارٹر

بلوچستان لبریشن چارٹر کو پیش کرنے کا بنیادی مقصد گروہی مقاصد سے نکل کر پوری دنیا کے سامنے بلوچ قوم کا ایک مشترکہ موقف پیش کرنا اور بلوچ عوام سے آزادی کے بعد حقیقی جمہوریت و خوشحالی کا وعدہ و معاہدہ تھا۔ پہلے اس چارٹر کے بارے میں تمام تنظیموں اور پارٹیوں نے مثبت رائے دی لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا تو اس سے انکاری ہو کر ڈاکٹر اللہ نظر اور براہمداغ سمیت باقی سب نے یہ مفروضہ قائم کر کے مغالطہ پھیلانا شروع کر دیا کہ ’’ہر پارٹی کا اپنا اپنا چارٹر ہے اس لئے اسکی ضرورت نہیں اور ہم اسے قبول نہیں کرتے‘‘۔ چارٹر ایک بین الادارتی، بین الاقوامی یا بین الالبراعظمی معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت مشترکہ مفادات کے تحت اکھٹا ہوا جاتا ہے جیسے کے اٹلانٹک چارٹر، انٹرنیشنل ڈیکلیریشن آف ہیومن رائٹس یا سینٹو و سیٹو وغیرہ اور ایک پارٹی منشور اپنے کارکنوں اور اپنے پارٹی کی جانب سے قوم کے ساتھ ایک وعدہ یا معاہدہ ہوتا ہے جیسے کہ بی این ایم یا بی آر پی کے منشور ہیں جو اپنے کارکنوں کو ایک روڈ میپ دیتے ہیں اور اپنے پارٹیوں کی جانب سے بلوچ قوم سے یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ آزادی کیلئے جدوجہد کریں گے لیکن بلوچستان لبریشن چارٹر کے پیش ہونے سے پہلے پورے قومی تحریک کے حوالے سے بلوچ قوم کے ساتھ نا کوئی معاہدہ یا کمٹمنٹ تھی اور نا روڈ میپ اور نا ہی دنیا کے سامنے ایک موقف یعنی کوئی منشور اور چارٹر اپنے ہیت، مقاصد اور متن میں بالکل جدا جدا دستاویزات ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ اپنا اپنا چارٹر کا یہ شوشہ محض ایک مفروضہ ہے لیکن پھر بھی غور کیا جائے کہ یہ مفروضہ کیوں زبان زد عام کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے ان کو چارٹر کے نکات سے اختلاف ہو؟ لیکن نہیں چارٹر سب کو یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ آزادی اور جمہوریت کے علاوہ باقی تمام نکات میں ردوبدل کی جا سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے انہیں یہ شک ہو کہ وہ اس چارٹر کے ذریعے سے سنگت حیربیار کے پابند ہونگے؟ لیکن نہیں اس چارٹر میں کوئی ایک شق بھی ایسی نہیں جس سے ان تنظیموں کے داخلی امور پر حیربیار اثر انداز ہو سکے بالفرض ہوتی بھی تو پھر وہ اس شق کو بدلنے کا پورا استحقاق بھی رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر اللہ نظر اور خلیل و کریمہ بلوچ سوشلسٹ ہیں اور انہیں چارٹر کے جمہوریت والے شق سے اختلاف ہو جو نا قابلِ ترمیم و تنسیخ ہے کیونکہ سوشلزم میں جمہوریت نہیں بلکہ پرولتاری آمریت ہوتی ہے؟ ایسا ہوسکتا ہے لیکن اگر ایسا مسئلہ تھا تو پھر انہیں اپنا موقف واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرنا چاہئے کہ ہم جمہوریت نہیں چاہتے لیکن پھر بھی نہیں کیونکہ انکے سوشلزم کے نعروں کو اگر انکے کردار و اعمال اور سرمایہ دارانہ ممالک سے امداد کے اپیلوں کے تناظر میں دیکھیں تو یہ نعرہ بھی ایک مفروضہ لگتا ہے۔ بہت سے قیاسات کی جا سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چارٹر کو نا مذکورہ وجوہات کے بنیاد پر مسترد کیا گیا اور نا ہی اسلیئے مسترد ہوا کہ سب کا اپنا اپنا چارٹر ہے بلکہ اسکی واحد وجہ یہ تھی کے چارٹر کو تسلیم کر کے قومی تحریک سے نا کوئی گروہ، پارٹی یا تنظیم بالا ہوتی اور نا کوئی عالمی سطح پر خفیہ طریقے سے اپنے لیئے گروہی مفادات حاصل کر پاتا مختصراًیہ کہ چارٹر گروہیت کی نفی کرتی ہے اور قومیت کی وکالت اسی لیئے یہ چارٹر ان گروہیت پسندوں کی طرف سے مسترد ہوا اور باقی یہ اپنا اپنا چارٹر والی بات محض ایک مفروضہ ہے تاکہ بلوچ عوام میں مغالطے پیدا کر کے حقائق چھپائے جائیں۔

☆۔سنگت حیربیار ایک فرد ھیں

گذشتہ چند سالوں سے سنگت حیربیار کی طرف سے چارٹر کا پیش کرنا ہو یا تیرہ نومبر کو بلوچ شہدا کا دن قرار دینا یا کوئی بھی اور مثبت قدم اسے باقی ماندہ لیڈرشپ مختلف حیلوں اور بہانوں سے مسترد کرتی رہی ہے اور ان بہانوں میں ایک اور مفروضہ کہ ’’حیربیار کا کوئی بھی ادارہ نہیں بلکہ وہ ایک فرد ہیں اور انفرادی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اسلیئے انکے اقدامات قابلِ قبول نہیں‘‘ قائم کر کے مغالطہ پھیلایا جا رہا ہے۔ یہاں کچھ حقائق اور ہمارا سیاسی کلچر غور طلب ہے۔ بلوچ سیاست میں ابتداء سے سیاسی ادارے کا تصور کمیونسٹ نظریے خاص طور پر بالشویک پارٹی سے مستعار لیا گیا ہے یعنی ہم سیاسی ادارہ اس جماعت کو سمجھتے ہیں جس کی ساخت سینٹرل ڈیموکریسی پر مبنی ہو اور قیادت و رینک ظاہر ہوں مطلب وہی اوپر ایک چیئرمین ہوگا پھر ایک کابینہ، پھر کوئی سینٹرل ایگزیٹو کمیٹی، پھر کچھ زون اور پھر ان زونوں کے یونٹ یا اسی سے ملتا جلتا۔ کمیونسٹ پارٹیاں اس طرز کو اسلیئے

استعمال کرتے رہیں کیونکہ ان کا مقصد مسند اقتدار سے ایک گروہ کو ہٹا کر اختیارات پارٹی کے ہاتھ میں لینا ہوتا ہے اور اقتدار پر قبضے کے بعد پارٹی کا رینک حکومتی رینک بن جاتی ہے یعنی چیئرمین صدر بن جائے گا کابینہ وزیر بنیں گے اور باقی اسی طرح ذیلی اختیارات کو سنبھالتے جائیں گے لیکن بلوچ کے معروضی حالات و ذمینی حقائق اس سے مختلف ہیں۔ یہاں اقتدار پر قبضہ و تشکیل کی جنگ نہیں بلکہ قوم و ریاست کی تشکیل کی جنگ ہے، ایک تو یہاں کم اور بکھری آبادیاں ہیں جس کی وجہ سے سرفیس پر کوئی معنی خیز تحریک آج تک چلائی نہیں جاسکی ہے اور دوسری طرف غیر جمہوری دشمن کسی طور پر آپ کے ظاھری سرگرمیوں کو پنپنے نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ گذشتہ پانچ سال کے دوران دشمن نے ظاھر سیاسی کارکنان

چارٹر ایک بین الاداراتی، بین الاقوامی یا بین الالبراعظمی معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت مشترکہ مفادات کے تحت اکھٹا ہوا جاتا ہے جیسے کے اٹلانٹک چارٹر، انٹرنیشنل ڈیکلیریشن آف ہیومن رائٹس یا سینٹو وسیٹو وغیرہ اور ایک پارٹی منشور اپنے کارکنوں اور اپنے پارٹی کی جانب سے قوم کے ساتھ ایک وعدہ یا معاہدہ ہوتا ہے جیسے کہ بی این ایم یا بی آر پی کے منشور ہیں جو اپنے کارکنوں کو ایک روڈ میپ دیتے ہیں اور اپنے پارٹیوں کی جانب سے بلوچ قوم سے یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ آزادی کیلئے جدوجہد کریں گے لیکن بلوچستان لبریشن چارٹر کے پیش ہونے سے پہلے قومی تحریک حوالے سے بلوچ قوم کے ساتھ نا کوئی معاہدہ یا کمٹمنٹ تھی اور نا روڈ میپ اور نا ہی دنیا کے سامنے ایک موقف یعنی کوئی منشور اور چارٹر اپنے ہیت، مقاصد اور متن میں بالکل جدا جدا دستاویزات ہوتے ہیں

سے لیکر لیڈر شپ تک سب کا صفایا کر دیا لیکن ہمارے سیاست میں روایت پسندی اتنی راسخ ہوچکی ہے کہ بار بار ایک رستے پر چلنے سے نقصان اٹھانے کے باوجود وہ بضد نظر آتے ہیں کہ رستہ تبدیل نہیں کیا جائے۔ سنگت حیر بیار کا موجودہ تحریک کا آغاز کرنے میں ایک بہت بڑا کردار رہا ہے، وہ آج کے موجود باقی ماندہ قیادت سے پہلے ہی نا صرف اس تحریک کا حصہ تھے بلکہ اسکی قیادت بھی کر رہے تھے لیکن انہوں نے روایتی طرز سیاست کو مسترد کرتے ہوئے ایک غیر روایتی اور مخفی طریقے سے اداروں کی تشکیل کی، ایک درآمد کردہ ماڈل پر ساخت کو استوار کرنے کے بجائے، اسے تجربات اور معروضی حالات کے مطابق تشکیل دی گئی اور اتنی لچک پیدا کی گئی کے یہ وقت و حالات کے مطابق اپنی ہیت بدلتے ہوئے تجربات کے بنیاد پر ایک ایسی حقیقی شکل اختیار کرے جو باہر سے درآمد کردہ نہیں بلکہ بلوچ نفسیات و ضروریات کے مطابق ہو اور دوسری طرف نمود و نمائش کے بجائے گمنامی و رازداری کو بنیادی اصول بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ریاستی آپریشنوں، کئی ساتھیوں کے اغواء و قتل، مہران اور بابا مری کی طرف سے دولخت کرنے کی کوششوں، اسلحہ و مڈی سے محروم ہونے اور تمام عسکری و غیر عسکری بلوچ تنظیموں سے اختلاف رکھنے کے باوجود نا صرف بی ایل اے 17 سال گذرنے کے باوجود مضبوطی سے اپنی جگہ کھڑا ہے بلکہ آج تک دشمن تک کو اسکی درست تعداد، نیٹورک، قیادت اور فیصلہ ساز اداروں کے بارے میں علم نہیں، لیکن دوسری طرف براہمداغ و ڈاکٹر اللہ نظر برملا اپنے ناموں کے ساتھ سربراہ کا لاحقہ لگاتے ہیں، ڈاکٹر اللہ نظر انٹرویو کے دوران اپنی تعداد میڈیا کو بتاتے ہیں اور انڈر گراونڈ تنظیم کے مرکزی اجلاس کے بیانات اخباروں کے سرخیوں کی زینت ہوتی ہیں، آج مکران کے کسی بھی علاقے میں جائیں تو وہاں ان مسلح تنظیموں کے علاقائی کمانڈروں کے نام پوچھیں تو کمانڈر کیا ہر ایک کارکن کا بھی نام پتہ سب پر ظاھر ہیں، ایسا بھی نہیں کے اس روایتی، شوشائی سیاست سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں بلکہ کئی مخلص کارکن اس نمود کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں لیکن روایت اور نام کو زندہ رکھنے کیلئے شاید ان جانوں کو قیمت کے طور پر ادا کی جارہی ہے۔ اب اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یار لوگ اپنے ظاھری خدوخال کو ادارے سے تشبیہ دیتے ہیں اور حیر بیار کو ایک فرد قرار دیتے ہیں حالانکہ ظاھریت ہرگز ادارے کیلئے شرط نہیں بلکہ ادارہ کوئی بھی ظاھر و مخفی ڈھانچہ جو قوم پروگرام کو آگے بڑھائے ہوسکتا ہے، حتیٰ کے ادارے کیلئے افراد بھی لازمی شرط نہیں ہیں بلکہ کچھ غیر تحریری سادہ سے روایات، رسم، قانون یا اصول بھی ادارہ کہلائے جاسکتے۔ ظاھریت کو ادارے کا شرط قرار دینا محض سیاسی نابالغی بھی نہیں بلکہ دانستہ طور پر باقیوں کو بھی اس کیچڑ میں کھینچ کر میلہ کرنا ہے جس میں وہ خود اٹے ہوئے ہیں اور سنگین نقصانات کا موجب بنتے جارہے ہیں ۔ بالفرض اگر حیر بیار کسی ادارے کا حصہ نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو پھر ہمیں ان کے دیوتائی صلاحیتوں کا لوہا ماننا ہوگا کہ وہ ایک شخص ایک طرف پوری ایک تنظیم کامیابی کے ساتھ دو دہائیوں سے چلا رہے ہیں اور دوسری طرف بیرون ملک ایک انتہائی

موثر سفارت کار کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دے رہے ہیں، اسی طرح وہ تن تنہا تنظیم کو اندرونی خلفشار سے نکال کر واپس ایک مضبوط پوزیشن میں کھڑا کر دیتے ہیں اور باقی درجن بھر تنظیموں اور لیڈروں سے اصولی اختلاف رکھ کر تنہا سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ آج جتنی بھی عسکری و غیر عسکری تنظیمیں وجود رکھتے ہیں ان سب کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں سنگت حیر بیار کا سیاسی، اخلاقی، عسکری اور مالی کمک شامل ہوتا ہے۔ یقیناً سنگت حیر بیار قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں لیکن وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارے کے سربراہ کے حیثیت سے اور ایک ادارے کے پالیسیوں کے تحت ہی یہ فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں اب ضروری نہیں کے ان اداروں کی ساخت یا طریقہ کار ان رایتی طریقوں پر استوار ہو جو ہمیں سمجھ آتا ہے، یہ بھی ضروری نہیں کے جو ہمیں سمجھ نہیں آتا وہ وجود نہیں رکھتا۔

☆۔ پرامن جمہوری جدوجہد

بی ایس او آزاد کے متنازعہ مغوی چیئرمین زاہد بلوچ کی ریاستی اداروں کے ہاتھوں اغواء کے بعد بی ایس او آزاد ایک مشکوک طریقے سے اچانک پرامن جمہوری جدوجہد اور عدم تشدد کا نعرہ لگانے لگا۔ اس دوران بی ایس او کا موقف بلوچوں کے اس دیرینہ موقف کے منافی رہا اور تردید کرتا رہا جو ہمیشہ سے بلوچ مسلح محاذ کا جواز رہا ہے یعنی بی ایس او آزاد نے نا صرف بلوچ مسلح مزاحمت کی اعلانیہ حمایت چھوڑ کر پرامن جمہوری جدوجہد اور عدم تشدد کا دم بھرنے لگا بلکہ اسی ضمن میں پاکستانی برینڈ کے سوشلسٹ جماعتوں سے تعلقات استوار کر کے مشترکہ پروگرام بھی کرنے لگی یہاں سے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر ایک ایسا مفروضہ قائم ہو گیا جو بلوچ مسلح جدوجہد کی نفی کر رہا ہے یعنی یہ مغالطہ سیاسی کارکنان میں عام ہو گیا کہ جو سرفیس پر جلسے جلوس کرتی ہے وہ سیاست ہے اور جو بندوق ہاتھ میں لیئے لڑ رہا ہے وہ تشدد یا جنگ ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت لازم ہے کہ بلوچ مسلح جدوجہد اس دلیل کے ساتھ چل رہی ہے کہ پاکستان ایک غیر جمہوری ملک ہے، جس نے پرامن سرفیس یا کھلی سیاست کی راہیں مسدود کر دی ہیں، یہاں پرامن طریقے سے اٹھائے گئے آواز کو نا صرف ان سنی کی جاتی ہے بلکہ اسے بندوق کے زور سے خاموش کیا جاتا ہے، ہمارے سینکڑوں پرامن سیاسی کارکنان کو شہید اور ہزاروں کو اغواء کیا جا چکا ہے، اسی لیئے ہم نے مجبوراً پرامن سیاست یا جدوجہد کا راستہ چھوڑ کر مسلح سیاست یا جدوجہد کا راستہ اپنایا ہے تاکہ ہم بندوق کے آواز سے اپنی بات سنا سکیں اور اپنا تحفظ کر سکیں۔ اس کے ساتھ یہ جواز بھی کہ بلوچستان پر قبضہ بھی پاکستان نے اسلحہ و ٹینکوں کے زور پر ممکن بنایا اب اپنے سرزمین کے دفاع اور دشمن کو نکالنا اس غیر جمہوری قابض ملک میں احتجاجوں سے ممکن نہیں اسلیئے سرزمین کے دفاع اور قبضہ ختم کرنے کیلئے بندوق کا سہارا لیا گیا۔ یعنی آج بلوچ کے ہاتھ میں جو بندوق ہے اور اس سے چلنی والی گولی بھی سیاست ہے اور سیاسی مقاصد رکھتی ہے اور یہی دلیل بلوچ مسلح محاذ کو دہشتگردی نہیں بلکہ دفاع ثابت کرتی ہے، ایک مسلح جہد کار کو دہشت گرد سے انقلابی بناتی ہے۔ یعنی اگر آج بی ایس او عدم تشدد کا دم بھر کر رحم کی اپیلیں کر رہا ہے تو پھر وہ اس مسلح محاذ کا دفاع کیسے کر سکے گا جو عدم تشدد کے سیاست کو ناممکن قرار دیکر اپنے پر تشدد سیاست کو جواز فراہم کرتا رہا ہے، جو پہلے سے اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ پاکستان میں پرامن جمہوری جدوجہد ناممکن ہے اسلیئے ہم نے ہتھیار اٹھایا ہوا ہے اور اگر آزادی کے کھلم کھلا موقف اور مسلح محاذ کی حمایت پر بی ایس او کمپرومائز کر کے سرفیس سیاست کرتی بھی ہے تو پھر اس سیاست کی کیا ضرورت وہ تو بی این پی اور نیشنل پارٹی کے طلباء ونگ پہلے سے کر رہے تھے، یعنی بی ایس او اگر حقیقی سیاست کرنا چاہتی ہے تو وہ مسلح محاذ کے پر تشدد راستے کا دفاع کر کے ہی اس پر گامزن ہو گا اور مسلح محاذ کے دفاع کی صورت میں وہ روایتی سرفیس سیاست نہیں کر سکتی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے بجائے وہی روایتی سیاست کے نقش قدم پر چلنے کیلئے بی ایس او اپنے حقیقی موقف اور پوزیشن سے دستبردار ہو سکتی ہے مطلب یہ کہ اس وقت یا بی ایس او ظاہری سیاست کر سکتی ہے یا سچ اور حقیقت کی سیاست اور بی ایس او اپنے لیئے اول الذکر کا چناو کر رہا ہے پھر ظاھر ہے وہ سچ اور حقیقت سے کٹ جائے گا اور اگر بی ایس او اس سے کٹ جاتی ہے تو پھر بی ایس او کے سو زون ہوں یا ہزاروں کارکنان، لاکھوں کے جلسے کرے یا کروڑوں کا چندہ جمع کرے وہ قومی تحریک کیلئے بے سود بلکہ نقصاندہ ہی ثابت ہو گا، کم از کم میں بی ایس او کی موجودہ اصولی موقف سے روگردانی کو مشکوک نظر سے دیکھ رہا ہوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ پاکستانی خفیہ ادارے غیر محسوس انداز میں بی ایس او کے اندر بلوچ طلباء کی صورت میں داخل ہو چکے ہیں اور اب اسکے پالیسیوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سینکڑوں فرزند مارنے کے باوجود بی ایس او کو ریاست ختم نہیں کر سکا لیکن اگر ریاست آسانی سے بی ایس او کے موقف کو بدل دے تو یہ از خود اسکی موت ہے۔ بہت سے سیاسی کارکنان نادانستہ طور پر بھی اس مغالطے کا شکار ہیں اور بلوچ مسلح جدوجہد کو سیاست سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ نقطہ نظر اور ضرورت کے حساب سے اس جدوجہد کو عسکری و غیر عسکری، سرفیس و انڈر گراونڈ، مسلح و غیر مسلح سیاست کے نام سے پکارا یا تقسیم کی جا سکتا ہے لیکن روڈوں پر نعرے لگانے والا کوئی کارکن ہو یا پہاڑوں پر بندوق اٹھایا ہوا کوئی سرمچار دونوں بلوچ آزادی کی سیاست کر رہے ہیں اور دونوں ہی سیاسی کارکن ہیں

☆۔ اتحاد

سنگت حیر بیار اور اسکے فکری رفقاء بلوچ سیاست میں جو اصولی اختلاف رکھتے ہیں اس کا اظہار وہ نا صرف شروع دن سے کرتے آئیں ہیں بلکہ سوشل میڈیا میں اس کی تشریح و جواز بھی بار ہا بیان ہو چکی ہے، یہاں انکی مزید وضاحت ضروری نہیں لیکن ان اختلافات اور انکے طریقہ اظہار کو لیکر یار لوگ شروع سے ایک اور مفروضہ گھڑ کر بلوچ عوام میں مغالطہ پیدا

کررہے ہیں کہ سنگت حیر بیار اور اسکے رفقاء بلوچ سیاست میں اتحاد کے خلاف ہیں یا اتحاد توڑنا و انتشار پھیلانا چاہتے ہیں لیکن حقائق اس مفروضے کے بالکل برعکس ہیں سنگت حیر بیار شروع دن سے ہی گروہیت کی نفی کرتے ہوئے بلوچ سیاست میں اجتماعیت کے قائل رہے ہیں جو اسکے طرز عمل سے بھی واضح ہوتا ہے۔آج جس طرز اتحاد کی باتیں ہورہی ہیں وہ یہ ہیں کہ مختلف تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر جوڑ کر جدوجہد کیا جائے ،لیکن سنگت حیر بیار کا شروع سے ہی موقف یہ رہا ہے کہ جدوجہد کا بنیادی قومیت و اجتماعیت پر ہوا یسے گروہ ہی تشکیل نہیں دیئے جائیں کے جن کو بعد میں جوڑنے کی ضرورت پڑے،یعنی ضروریات کے مطابق پارٹی یا تنظیم ضرور بنائے جاتے لیکن ہر ایک کا راستہ وفکر الگ نہیں ہوتا، سب الگ الگ ملکیت کے دعویدار نہیں بلکہ ایک موقف کے اظہار کے مختلف طریقے ہوتے ،اگر ایسا ہوتا تو آج اتحاد کی باتیں دور کی بات اسکی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔سوال یہ نہیں ہے کہ اتحاد کیسے اور کیوں قائم کی جائے حقیقی سوال تو یہ ہے کہ ہم اتنے ٹکڑوں میں بٹے کیسے کہ آج اتحاد کی ضرورت پڑے؟اس سوال کے جواب کے بعد میرے خیال میں راستہ مزید واضح ہوجاتا ہے۔ ابتداء میں جب تحریک کا آغاز ہوا تو صرف بی ایل اے وجود رکھتی تھی لیکن بعدازاں جو بھی بلوچ جہد کرنے میدان عمل میں آیا اسکے جدا شناخت وحیثیت کے باوجود اسکی پوری مدد کی گئی اگر حیر بیار گروہیت کے قائل ہوتے تو پھر بی ایل اے کے سوا کسی اور تنظیم کو پنپنے کیوں دیتے؟اسی طرح جب براہمداغ بگٹی بی آر اے بنانا چاہتے تھے تو اسے باقاعدہ پیشکش ہوئی کے علیحدہ تنظیم کے بجائے آپ بی ایل اے کی قیادت سنبھالیں ،اسی طرح بلوچستان لبریشن چارٹر پر غور کیا جائے تو وہ کیا ہے؟وہ بھی تمام بلوچوں کو اکھٹا رکھنے اور ایک موقف پر لانے کی کوشش ہے،تیرہ نومبر کا تمام شہداء کو بلا تفریق گروہ ایک ساتھ یاد کرنے کیلئے حیر بیار کی طرف سے یا مشورے سے مختص ہوا،بی ایل اے کا بیرک جب عام ہوا تو وہ بلوچستان کا بن گیا بی ایل اے نے اس پر اپنا گروہی دعویٰ نہیں کیا،یہاں تک کے بقولِ بشیر زیب بلوچ 2010 میں جب وہ اتحاد کیلئے ڈاکٹر اللہ نظر کے پاس گئے تو اس حد تک راضی ہوئے کہ اگر ڈاکٹر اللہ نظر چاہتے ہیں تو اتحاد کے بعد بی ایل اے کا نام ختم کر کے صرف بی ایل ایف کے نام سے جہد کیا جائے گا۔جب بی این ایف کا قیام عمل میں آتا ہے تو اسکا حصہ نا ہونے کے باوجود اسکے سب سے بڑے حمایتی حیر بیار ہوتے ہیں حتیٰ کے ان اختلافات اور تضادات کے بیچ میں بھی ان مسائل کو حل کرنے کے خاطر چند ماہ پہلے تک سنگت حیر بیار اتحاد کے غرض سے مہران مری اور براہمداغ بگٹی سے ملنے جنیوا جانے تک راضی ہوتے ہیں غرض آپ سنگت حیر بیار کے ہر عمل کو پرکھیں آپ کو اس میں اجتماعی اور قومی سوچ نظر آئے گی حتیٰ کے وہ اپنے پوزیشن تک کو گھٹاتے ہوئے ڈاکٹر اللہ نظر کو لیڈر اور خود کو محض بیرونی ملک ایک ادنیٰ سیاسی کارکن و سفارت کہتے رہے،آج اگر سوشل میڈیا پر تنقید وسوال کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس سے بھی نا انکے گروہ کو کوئی فائدہ ہوگا نا اسکے شہرت میں اضافہ بلکہ اسکا مطمع نظر یہی ہے کہ ہمیں اگر گروہی لحاظ سے کوئی نقصان ہوتا ہے پرواہ نہیں لیکن قومی مسائل کے بابت خاموشی اختیار نہیں کی جائے لیکن شروع سے ہی نا صرف سنگت حیر بیار کے اجتماعیت کی کوششوں کو رد کیا گیا بلکہ باقی سب کی کوشش ہمیشہ سے یہی رہی کہ اپنے اپنے گروہوں اور لیڈروں کے قد وکاٹ میں اضافہ کیا جائے۔لیکن یہاں ایک سوال بھی اٹھتا ہے کہ اگر سنگت حیر بیار اتحاد پر راضی ہیں اور باقی سب اپنے اخباری بیانوں میں اتحاد کی باتیں کرتی رہتی ہیں اور ہاتھوں کی زنجیر بنا کر اتحاد کا تصویری مظاہرہ بھی کرتی ہیں تو پھر اس اتحاد کے سامنے رکاوٹ کیا ہے؟ یہاں سب سے پہلے ان موقفوں کو سمجھنا پڑے گا کہ کون کیسا اتحاد چاہتا ہے،سنگت حیر بیار کا موقف یہ رہا ہے کہ ایسا اتحاد قائم ہو جس میں گروہیت کی نفی ہو،اگر ایک اتحاد میں رہنے کے باوجود ہر گروہ اس کوشش میں رہے گا کہ میرا نام زیادہ چمکے یا مجھے زیادہ فائدہ حاصل ہو تو پھر اس کا انجام ماضی کے اتحادوں کی طرح ہوگا،اتحاد کو کچھ اصولوں سے منتھی کیا جائے تاکہ اسے کوئی توڑ نا سکے،اتحاد کا مطلب صرف پارٹیوں کو باندھ کر رکھنا نا ہو بلکہ اسکا مطلب ومقصد سوچ اور طرز عمل میں اجتماعیت وقومیت ہو لیکن یار لوگوں کا اتحاد کا خواب مختلف ہے پہلے تو یہ اتحاد کی باتیں اور ہاتھوں کی زنجیر بنانا خواہش سے زیادہ مجبوری ہیں یہ اس دباؤ کا نتیجہ ہے جو سوشل میڈیا پر تنقید کی صورت میں سامنے آرہی ہے درحقیقت کوئی بھی اپنے گروہی حیثیت کو قربان کرنا نہیں چاہتا ہر کسی کا خواہش ہے کہ اسکا اپنا گروہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے اور باقی تنظیمیں کمزور ہوں اب بادل نخواستہ اتحاد کرنا بھی پڑے تو ان کے ذہن میں اتحاد کا خاکہ پارلیمانی جماعتوں کے الیکشنوں کی اتحاد جیسی ہے جہاں لیڈران ایک اسٹیج پر ساتھ بیٹھے تو ہوتے ہیں لیکن سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اتحاد کی وجہ سے آنے والی ہجوم سے ہر کوئی اپنے گروہ کیلئے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے ،غرض یار لوگوں کے اتحاد کا مقصد ہی ایک عارضی تنقید کو روکنا اور ساتھ میں اپنے گروہیت کو بھی جاری رکھنا ہے وہ کبھی بھی حقیقی اتحاد پر نا پہلے راضی تھا اور نا اب ہے،لیکن بلوچ عوام کے بڑھتے دباؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ یہ مفروضہ گھڑ کر مغالطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ حیر بیار اتحاد کے خلاف ہے یہ صراصر جھوٹ اور لغو ہے

☆۔فیس بک پر ہتک آمیزی

میں مختصراً ایک اور مغالطے کی تشریح اور وضاحت کرنا چاہوں گا جسے بہت تیزی سے بلوچ عوام میں پھیلایا جا رہا ہے،وہ یہ کہ فیس بک پر سنگت حیر بیار اور اسکے ساتھی دشنام طرازی، گالیوں اور ہتک آمیزی کا مظاہرہ کررہے ہیں،یہ سراسر جھوٹ اور الزام ہے۔فیس بک کو حیر بیار کے فکری رفقاء نے اسلئے چنا کیونکہ یہ بلوچ عوام سے رابطے کا فوری اور محفوظ طریقہ تھا،اس ضمن میں ضرور روایتی احترام اور لحاظ کا خیال نہیں رکھا گیا اور بابا خیر بخش مری سے لیکر ایک مجھ جیسے ادنیٰ سیاسی کارکن تک سب پر سوالات اٹھائے گئے لیکن ان تمام سوالات

ابتداء میں جب تحریک کا آغاز ہوا تو صرف بی ایل اے وجود رکھتی تھی لیکن بعدازاں جو بھی بلوچ جہد کرنے میدان عمل میں آیا اسکے جدا شناخت وحیثیت کے باوجود اسکی پوری مدد کی گئی اگر حیربیار گروہیت کے قائل ہوتے تو پھر بی ایل اے کے سوا کسی اور تنظیم کو پنپنے کیوں دیتے؟ اسی طرح جب براہمداغ بگٹی بی آر اے بنانا چاہتے تھے تو اسے باقاعدہ پیشکش ہوئی کے علیحدہ تنظیم کے بجائے آپ بی ایل اے کی قیادت سنبھالیں، اسی طرح بلوچستان لبریشن چارٹر پر غور کیا جائے تو وہ کیا ہے؟ وہ بھی تمام بلوچوں کو اکھٹا رکھنے اور ایک موقف پر لانے کی کوشش ہے، تیرہ نومبر کا تمام شہداء کو بلا تفریق گروہ ایک ساتھ یاد کرنے کیلئے حیربیار کی طرف سے یا مشورے سے مختص ہوا، بی ایل اے کا بیرک جب عام ہوا تو وہ بلوچستان کا بن گیا بی ایل اے نے اس پر اپنا گروہی دعویٰ نہیں کیا، یہاں تک کے بقولِ بشیر زیب بلوچ 2010 میں جب وہ اتحاد کیلئے ڈاکٹر اللہ نظر کے پاس گئے تو اس حد تک راضی ہوئے کہ اگر ڈاکٹر اللہ نظر چاہتے ہیں تو اتحاد کے بعد بی ایل اے کا نام ختم کر کے صرف بی ایل ایف کے نام سے جہد کیا جائے

☆ ________________________________ ☆

کی نوعیت مکمل طور پر سیاسی اور قومی معاملات سے جڑے ہیں لیکن یار لوگوں کا شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ کسی بھی طور اس عمل کو روکا جائے تاکہ انکے منفی اعمال کبھی منظر عام پر نا آسکیں اسی ضمن میں ایک طرف وہ لیڈروں اور پارٹیوں کے بیانات میں لوگوں سے دور رہنے اور کا مشورہ دیتے رہے اپنے کارکنوں پر پابندی لگاتے رہے تو دوسری طرف اس تنقیدی سلسلے کو روکنے کیلئے ایک قبیح عمل کا مرتکب یوں ہوئے کہ مختلف فرضی آئی ڈی تشکیل دیکر گالیوں اور ہتک آمیزی کا بازار گرم کرتے رہے تاکہ ماحول کو پراگندہ کر کے یہ تاثر دیا جاسکے کہ فیس بک پر غیر سنجیدہ لوگ باتیں کر رہے ہیں اسلئے ان پر توجہ نا دی جائے، یہ محض ایک منفی سیاسی حربہ تھا اب اپنے اسی قبیح عمل کو جواز بنا کر وہ مسلسل الزام فکری دوستوں پر دھر رہے ہیں تاکہ اس عمل کو متنازعہ بنایا جاسکے حالانکہ جو شخص بھی فیس بک باقاعدگی سے دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ حیربیار کے فکری رفقاء ایک سنجیدہ بحث آگے لیجا رہے ہیں اور یہ ہتک آمیزی مخالف سمت سے انکے جواب میں آرہا ہے۔ یار لوگوں کے اس منفی سیاسی حربے سے تنقید وسوال کا سلسلہ تو نہیں رکے گا لیکن بلوچ عوام کو اپنے پرکھ کا معیار بہتر کر کے اس قبیح سیاسی حربے اور ان مفروضات کو پہچاننا ہوگا تاکہ ہم کسی مغالطے کا شکار ہوئے بغیر سچائی تک پہنچ سکیں۔ جب کسی عمل یا کمٹمنٹ کا بنیاد کسی مفروضے یا مغالطے پر ہوگی تو وہ بالآخر انتشار، تضاد اور مایوسی پر ہی منتج ہوگی، مندرجہ بالا مفروضات ومغالطّوں کو دانستہ طور پر گھڑنے کا مقصد موجودہ اختلافات کے حقیقت اور وجود سے انکاری ہو کر اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنا رہا ہے لیکن اگر ہم اپنے بلوچ سیاست کا کلی تجزیہ کریں تو ہمیں ایسے مفروضات ومغالطّوں کے انبار نظر آتے ہیں، یعنی بابا مری، ڈاکٹر اللہ نظر اور براہمداغ بگٹی کو ہم آج جن القابات اور جس حیثیت سے نوازتے ہیں کیا واقعی انکا کردار اتنا ہی تھا یا ہے؟ یا پھر ہم نے مفروضات قائم کیئے ہوئے ہیں؟۔ موجودہ بی این ایم کو غلام محمد کا پارٹی سمجھنا کہیں کوئی مغالطہ تو نہیں؟ کیونکہ آج بی این ایم جن کے ہاتھوں میں ہے یا جس سوچ کے تحت چل رہی ہے غلام محمد تو پوری زندگی پارٹی کے اندر بھی ایسے لوگوں کے خلاف ایک الگ جہد میں مصروف تھے۔ بی ایس او کے بارے میں یہ مفروضہ عام ہے کہ بی ایس او تحریک کا ہراول دستہ اور ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن بی ایس او کے قیام کے بعد آزادی کی دو بڑی تحریکیں چلتی ہیں اور دونوں کے آغاز میں بی ایس او کا کردار صفر ہوتا ہے، پھر بھی ہراول دستہ؟ کیا موجودہ تحریک میں بلوچ طلباء میں شعور آزادی پھیلانے والے ڈاکٹر اللہ نظر تھے یا کچھ ایسے گمنام نام ہیں جو آج تک خود کو ظاہر نہیں کر رہے اور ڈاکٹر اللہ نظر بس صحیح موقع پا کر صرف سامنے آنے والے اور نظر آنے والے تھے؟ 73 کے تحریک کے ناکامی کے جو اسباب وعلل آپ اور مجھ تک پہنچے وہ حقیقت ہیں یا پھر مفروضات؟ کامیابی کے آفاقی شرائط ہوں یا پھر فطری وسائنسی اصول ہمیں ایک چیز سکھاتی ہیں کہ صحیح انجام کیلئے صحیح آغاز وصحیح راستہ ہی شرطِ لازم ہیں، جب تک ہم ان مفروضات اور مغالطّوں کے دنیا سے باہر نہیں نکلتے تب تک ہم نا صحیح آغاز کر سکتے ہیں اور نا ہی صحیح راستہ اختیار کر سکتے ہیں، اس تنقید سلسلے کا مقصد بھی اور کچھ نہیں سوائے اسکے کہ صحیح وغلط، سچ وجھوٹ اور حقیقت ومفروضات کو الگ الگ کر کے سامنے رکھا جائے جنہیں مفاداتی سیاسی شعبدہ بازوں وطالع آزماؤں نے اس حد تک مدغم کیا ہوا ہے کہ ہم انکے بیچ فرق کرنے سے قاصر ہیں، جب یہ الگ الگ ہونگے اور انکی پہچان ہو جائیگی پھر نا کامیاب وصحیح راستہ ہمارے نظروں سے اوجھل ہوگی اور نا ہی منزل دور ہوگی

::

اکیسویں صدی میں جنگیں نظریے، سوچ وفکر کی بنیاد پر نہیں بلکہ وسائل کیلئے لڑی جائیں گی!

بلوچ قومی بقاء کولاحق خطرات

__ شبیر بلوچ

بلوچستان جو رقبے کے لحاظ سے سویڈن، عراق، پیراگوئے، جاپان، فلپائن، ناروے، پولینڈ، اٹلی، برطانیہ، رومانیہ، شام، یوراگوئے، بنگلہ دیشن، یونان، کیوبا، جنوبی کوریا، ہنگری، پرتگال، آسٹریا سے وسیع اور کئی ممالک کے نسبت معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ دنیا میں ایسے بہت سے ممالک ہیں جن کی سرحدیں سمندروں کو چھونے سے محروم ہیں جنہیں لینڈ لاک کہا جاتا ہے جن میں افغانستان، آذربائیجان، چیک ریپبلک، ہنگری، قازقستان، ایتھوپیا، منگولیا، ازبکستان، زمبابوے، روانڈا اور پنجاب سرفہرست ہیں لیکن بلوچ سرزمین کی ایک ہزار کلومیٹر طویل ساحل نا صرف اسے قدرتی حسن سے نوازتی ہے بلکہ بحر بلوچ بلوچستان کی تزویراتی اہمیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ جس طرح فن لینڈ کو ہزاروں جھیلوں کی سرزمین، جاپان کو طلوعِ آفتاب کی سرزمین، نیپال کو پہاڑوں کی سرزمین کہا جاتا ہے اسی طرح بلوچستان کو لینڈ لاک وسطی ایشیاء کا چابی کہا جائے تو غلط نا ہوگا۔ بلوچستان کے اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی پاکستان نے چین کے معاونت سے گوادر ڈیپ سی پورٹ پر کام کا آغاز کیا تاکہ سینٹرل ایشیاء کے وسائل سے مالا مال ممالک کو اسی پورٹ کے ذریعے دنیا سے ملائیں۔ بلوچستان اپنے جغرافیائی، معاشی اور محل وقوع کی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی بین الاقوامی اور علاقائی طاقتوں کے نظر میں رہا ہے، بلوچستان میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ خطے میں تجارتی و سیاسی مرکز بن سکے۔ بہت سے تجزیہ نگاروں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آئل سیاست نے آئل جنگ کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اسکی پہلی جھلک نوے کے دہائی کے گلف جنگ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور دوسری افغانستان کی جنگ ہے جو وسط ایشائی کی وسائل تک رسائی کیلئے لڑی جا رہی ہے اور تیسرا عراق جنگ ہے اب اس امر کا قوی امکان ہے کہ یہی جنگ اپنی شکل اور ہیت بدل کر وسعت اختیار کرے گی۔ مائکل ٹی کلیر اپنی کتاب ''وسائل کی جنگ'' میں لکھتے ہیں کہ ''اکیسویں صدی میں جنگیں نظریے، سوچ و فکر کی بنیاد پر نہیں بلکہ وسائل کیلئے لڑی جائیں گی''۔ اکیسویں صدی کے پہلی دہائی کے عراق اور افغانستان کی جنگیں اس قیاس پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ آج ہمیں ان روایتی اور پراکسی جنگوں کی دور میں مختلف کھلاڑی مختلف ایجنڈوں کے ساتھ نمودار نظر آتے ہیں۔ وسائل کے کھینچا تانی کے دوڑ کے میدان میں ایک بلوچستان بھی ہے جہاں چین پاکستان کے توسط سے اپنے سرخ پنجے گاڑھنا چاہتی ہے۔ اگر چینی پنجابی گٹھ جوڑ کامیاب ہوتی ہے تو اس امر کا غالب امکان ہے کہ بلوچستان میں ایک قلیل مدت کے دوران کروڑوں نوآبادکار آباد کیئے جائیں گے۔ گوکہ بلوچستان ایک وسیع سرزمین ہے لیکن اس وقت پاکستان کے زیر قبضہ مشرقی بلوچستان میں بلوچوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے جس کی وجہ سے بلوچ اس طرز کے فوری مردم نگارانہ تبدیلی کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتے، آبادی کے اس بہاو کے نتیجے میں بے اختیار بلوچ اپنی شناخت کھودیں گے اور بلوچ بھی امریکہ کے مقامی ریڈ انڈینز، نیوزی لینڈ کے مقامی مایوریوں اور آسٹریلیاء کے مقامی ابارجینز کی طرح تاریخ کے صفحات میں گم ہوجائیں گے اور اپنے ہی سرزمین پر دائمی غلامی کے زنجیروں میں جکڑلی جائینگی۔ پھر بلوچ کی شناخت، ثقافت اور تاریخ ابارجینز اور ریڈ انڈینز کی طرح زمین پر نہیں بلکہ عجائب گھروں اور لائبریریوں میں ہی پائی جائے گی۔ انگریزوں نے جب آسٹریلیاء پر قبضہ کیا تو وہ اپنے بچوں کو کھیلنے کیلئے ابارجینز بچے دیا کرتے تھے جن کے گلے میں رسی باندھ کر وہ ان کے ساتھ کھلونوں کی طرح کھیلتے تھے۔ ایک بار دائمی غلامی کے گرداب میں پھنسنے کے بعد ابارجینز کے بچوں کے ساتھ کتوں جیسا سلوک کیا گیا، انکے عورتوں کی عزت اور مردوں کی جان ایک معمولی حیثیت اختیار کرگئی۔ گوکہ ریڈ انڈینز اور مایوریوں نے مزاحمت کی لیکن تاخیر کی وجہ سے انکا شیرازہ بکھر گیا اور انکا بھی انجام ابارجینز سے مختلف نہیں ہوا۔ اگر آج چین و پنجاب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں پھر بلوچ بھی تاریخ سے رحم اور مختلف نتیجے کی توقع نا رکھیں، شاید پھر بلوچوں کے بچوں کے گلے میں بھی کتوں کے پٹھے ہونگے اور وہ چینی و پنجابی بچوں کے کھلونے بنیں گے، پھر نا ہمیں رنجیدگی، آزردگی، آہ و زاری کام دے گا اور نا ہی پچھتاوہ ہمارے تکلیفوں کا مداوہ

ہوگا۔لیکن اگر بلوچ اپنے معروضی حالات، مادی حقائق اور سیاسی حالات کا درست ادراک رکھتے ہوئے حقیقی بلوچ نیشنلزم کو اپنا بنیاد بنا کر کسی بھی ازم کے زعم میں مبتلاء ہوئے بغیر صف بندی کرتی ہے تو پھر کامرانی بلوچ قوم کا مقدر بنے گی اور مستقبل میں بلوچ بھی مہذب، آزاد اور ترقی یافتہ اقوام کے صفوں میں خود کو پائے گی۔تاریخ دنیا کے ہر قوم کو اپنی تقدیر بدلنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے کچھ اقوام ان مواقع سے فائدے اٹھاتے ہوئے خوشحالی کی جانب گامزن ہوتی ہیں۔آج گو کہ بلوچ قوم غلامی اور پسماندگی کے پستیوں کو چھور رہا ہے لیکن ایک قیمتی موقع ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے اور ہم سے بیداری، عقلمندی اور شجاعت کا تقاضہ کر رہی ہے اور اگر آج بلوچ قوم گروہیت، شوقِ لیڈری، علاقائیت ،قبائلیت اور مراعات کی گہری نیند سوتا رہا تو پھر تقدیر کی دیوی ہم سے ایسے روٹھے گی کہ اس تغافل و بے پروائی کا خمیازہ ہماری آنے والی ہر نسل بھگتے گی اور پھر کھلتی آنکھیں صرف پشیمانی کا سورج ہی ہمیں دکھلائے گی۔بہت سے بلوچ سیاست دانوں اور تجزیہ نگاروں کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ دس یا پندرہ سال بلوچ تاریخ کے اہم ترین سال ہیں اگر بلوچ اس دوران آزادیا مستحکم پوزیشن حاصل نہیں کر پاتی تو پھر شاید ہمیں اپنے حیات ہی میں وہ دن دیکھنے پڑیں گے۔آج بلوچ قومی تحریک کو درپیش تمام چیلنجز اور مشکلات کا حل صرف اور صرف قومی سوچ اور قومی دھارے میں ہی مضمر ہیں۔اب پاکستان کی بھی کوشش ہے کہ وہ آسٹریلیا، نیوزلینڈ اور امریکہ کے مقامی باشندوں کی طرح بلوچوں کو بھی مکمل ختم کریں اور لوگوں میں تحریک کے حوالے سے ابہام پیدا کریں اور جدوجہد کا رخ کسی اور جانب موڑ دیں۔اپنے ان عزائم کی تکمیل کیلئے دشمن اپنے مخبر ہمارے پارٹیوں اور تنظیموں کے اندر بھی داخل کر رہا ہے اور ان لوگوں کے توسط سے جدوجہد کا رخ ایک غیر محسوس انداز میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، اسلئے حالات ہم سے یہ اٹل تقاضہ کرتی ہیں کہ اس ابہام اور گومگو کی کیفیت سے نکلنے کیلئے ہم صرف اپنا مطمع نظر قومی مفادات کو بناتے ہوئے اپنا کردار اور اعمال قومی دھارے میں ڈھالیں۔اب اس میں کوئی دورائے نہیں ہونا چاہئے کہ یہ جنگ بلوچ کی آخری جنگ ہے اسلئے ہم بالغ نظری، عاقبت اندیشی سے ہرگز پہلوتہی نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ناکام ہوئے تو پھر تا ابد اپنے سرزمین پر دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے اور اگر کامیاب ہوئے تو پھر اپنی طاقت، قوت، صلاحیت، ہنر سے ترقی یافتہ اقوام کی صفوں میں جگہ بنالیں گے لیکن اسکے لئے از حد ضروری ہے کہ ہم اپنے گروہی مفادات ترک کردیں، ہماری لیڈر شپ تصوراتی ذہنیت سے نکل کر حقیقت پسندی کا دامن تھامتے ہوئے درست سمت میں فیصلے کریں۔اگر ہم اپنے صفوں کو درست کرنے میں کامیاب ہوئے تو پھر بین الاقوامی طاقتیں بلوچ تحریک کو زیادہ دیر تک نظرانداز نہیں کرسکیں گے کیونکہ ہم اس سرزمین پر واقع ہیں جو وسطی ایشیاء کیلئے کھل جا سم سم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں بین الاقوامی قوتوں کی رائے بلوچ تحریک کے حق میں ہموار کرنے کیلئے مہذب اقوام، عالمی ادارے اور نان اسٹیٹ ایکٹرز کو بلوچ قومی مسئلے اور بلوچ نسل کشی سے آگاہ کرنا ہوگا، ہمیں اپنے لاپتہ افراد، مسخ شدہ لاشوں اور اجتماعی قبروں کے بابت دنیا کو آگاہی دینی ہوگی۔شہادتوں اور اغواوں کے اعداد وشمار کو مشترکہ طور پر ایک کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہمیں کامیابی مل سکتی ہے۔قومی غلامی میں سب سے زیادہ مقدم اور اولین مقصد قومی آزادی کی ہی ہوتی ہے اور قومی مفادات کی پہچان اور انکے حصول کیلئے عمل پیرائی ہی کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہے، جسطرح مشرقی تیمور کی جہد آزادی میں شنانا گوشماونے اور اریٹریا و کوسوو کی جہد میں انکے رہبروں نے عالمی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے قومی مفادات کی تشریح کرتے ہوئے سوشلزم، کمیونزم و ماوزم کے چکروں میں پڑے بغیر اپنے قومی مفادات کے حصول کو ممکن بنایا آج ہمارے معروضی حالات بھی ہم سے اسی طرح بالغ نظری کا تقاضہ کر رہے ہیں۔جسطرح سونے، چاندی اور تانبے کے زیور بنانے سے پہلے انہیں آگ پر تپایا جاتا ہے تو اس پر جھاگ کی ایک پرتھ نمودار ہوتی ہے پھر وہ جھاگ آہستہ آہستہ بیٹھ جاتا ہے یہی عمل تحریکوں میں بھی خود کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح بقولِ جیولس فیوچک آگ کی بھٹی میں جب لکڑی پھینکی جائے تو وہ راکھ بن جاتی ہے لیکن خام لوہا وہاں سے فولاد بن کر نکلتا ہے اسی طرح تبدیلی وجہد کی بھٹی بھی کرداروں کا پرکھ کرتے ہوئے لکڑی ولوہے کی پہچان کرتی ہے، کچھ لوگ اس بھٹی سے گذر کر فولاد بن کر نکلتے ہیں لیکن کچھ لوگ اس جھاگ کی طرح جذبات میں ابھر کر پھر کنفیوژن و ابہام کا شکار ہو کر فوری طور پر اسی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور اس آگ کے تپش کی وجہ سے اصل سونا ظاہر ہوجاتا ہے۔آج ہماری تحریک جس بھٹی سے گذر رہی ہے اس میں یہ امر ناگزیر بن چکا ہے کہ اپنے معروضی حالات کی پہچان اور بین الاقوامی صورتحال کا ادراک رکھتے ہوئے ہمیں اپنے قومی مفادات کو اولیت دینا ہوگا اور بلوچ قومی جہد کو سوشلزم سماجی برائیوں کے خاتمے کی کوشش وغیرہ جیسے نعروں سے کنفیوز کیئے بغیر ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔

اگر ہم عصر حاضر کے کچھ کامیاب و ناکام تحریکوں کا جائزہ لیں تو ان میں مشرقی تیمور، کوسوو، اریٹریا اور جنوبی سوڈان کو ہم کامیاب جبکہ تامل، مورو، چیچن وغیرہ کو ہم ناکام کہہ سکتے ہیں۔ان تحریکوں کا بغور جائزہ لیں تو ناکام تحریکیں آپس میں اور کامیاب تحریکیں اپنے اندر کافی حد تک مشترکہ قدریں اور مماثلت رکھتی ہیں۔یہاں ہم کامیاب تحریکوں کو ایسے ممتاز کرسکتی ہیں کہ یہ سب تصوراتی خیالات سے نکل کر حقیقت پسندانہ رجحانات اپناتے ہوئے قومی پالیسیاں ترتیب دینے میں کامیاب ہوئے اور باقی اپنے ذہنی حقائق و عالمی حالات سے پہلوتہی کرتے ہوئے اپنے مزاج اور قومی مفادات سے متصادم تصوراتی نظریوں کے گرداب میں خود کو پھنسا بیٹھے۔اگر بلوچ قوم بھی حقیقت پسندی کو وطیرہ بناتے ہوئے اپنے ترجیحات و مفادات کا تعین کرے تو کامیابی زیادہ دور نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سیاسی ناپختگی وگمراہ کن پروپیگنڈہ

اسلم بلوچ

____اگر ہم تاریخ پرنظر دوڑائیں تو ہمیں تمام بڑے تنازعات وتحریکات میں اور جنگوں کے دوران مخالفین کا آپس میں مذاکرات وملاقات کے بے شمار ثبوت ملیں گے مختلف حالات میں مختلف نقاط پر تبادلہ خیال وایجنڈوں کے نقاط پر اتفاق وعدم اتفاق کے سینکڑوں واقعات پڑھنے کوملیں گے اگر تحقیقات کیے جائیں تو ضرور ایسے لاکھوں مثالیں ملیں گے جنکا تجزیہ کیا جاسکتا ہے دیکھا جاسکتا ہے کہ آخروقت وحالات کے مطابق ایسے مذاکرات کیوں اور کس لیے کیے جاتے ہیں انکی ضرورت ونوعیت اورنقاط کوبھی سمجھا جاسکتا ہے اورانکے پیچھے چھپے عزائم کوبھی جانا جاسکتا ہے عمومی طور پر زیادہ تر شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ہرطرح کے حالات میں فریقین کا مقصد ایسے مذاکراتی عمل سے بھی زیادہ سے زیادہ اپنے مفادات کاتحفظ ہی کرنا ہوتا ہے لیبیا کے تحریک میں دوران جنگ عمرمختار سے دومختلف وفود کی ملاقاتیں ہوئیں جن میں سے ایک براۓ راست دشمن کے فوجی وفد سے ہوا تھا اوردوسرا قبائلی عمائدین سے جودشمن کے پیغام رساء بن کر آئے تھے دورجانے کی ضرورت نہیں 2003 سے لیکر 2005 کے آخر تک چوہدری شجاعت ومشاہد حسین کے سربراہی میں شہید نواب اکبرخان بگٹی سے ڈیرہ بگٹی میں درجنوں ملاقاتیں ہوئیں اس بات کوسمجھنے میں میرے خیال سے کوئی دقت نہیں کہ سیاسی تنازعات کے بیچ یادوران جنگ فریقین کاایک دوسرے سے مذاکرات وملاقات یامختلف نقاط یامطالبات پر پیغام رسانی کا کام ایک سیاسی عمل ہے جسکی حقیقت وضرورت سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے اورسیاسی تاریخ نے کہیں بھی اس عمل کے ممانعت کے طرف کسی بھی قسم کا اشارہ نہیں کیا ہے کم ازکم ہم نے آج تک نہ دیکھا اورنہ سنا ہے اس طرح کے مذاکرات وملاقاتوں کی نوعیت مختلف حالات میں مختلف ضرور ہوتے ہیں بعض اوقات اعلانیہ ہوتے ہیں اور اکثر وبیشتر پوشیدہ بھی رکھے جاتے ہیں اعلانیہ مذاکرات میں وفود وایجنڈے سامنے لائے جاتے ہیں، غیراعلانیہ مذاکرات میں وفود وایجنڈے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں، مذاکرات کے اعلانیہ یاغیراعلانیہ ہونے کاتعلق وقت وحالات کے مطابق ہوتا ہے لیکن اعلانیہ یاغیراعلانیہ حقیقی مذاکرات کے لئے فریقین کے پاس مضبوط سیاسی واخلاقی جواز ہوتا ہے یہ سیاسی عمل کا حصہ ہیں انکے مقاصد واضع ہوتے ہیں عام طور پر اس طرح کے عمل میں فریقین کا مقصد اپنے مفادات کاتحفظ کرنا ہوتا ہے، بلوچوں کے لیے اس سیاسی عمل کے امکانات سے کون انکار کرسکتا ہے، دوسری طرف اس طرح کے مذاکرات وملاقات کے عمل پرتحفظات اورتنقید بھی سیاسی عمل ہی کہلاتا ہے جس سے انکارنہیں کیا جاسکتا، لیکن جہاں حقیقی تنقید کیا جاتا ہے یا تحفظات پیش کیے جاتے ہیں وہاں ہدف تنقید واضع اور تحفظات کے نوعیت کی وضاحت ضرور ہوتا ہے، مثلا

اگر ہم تاریخ پرنظر دوڑائیں تو ہمیں تمام بڑے تنازعات وتحریکات میں اور جنگوں کے دوران مخالفین کا آپس میں مذاکرات وملاقات کے بے شمار ثبوت ملیں گے مختلف حالات میں مختلف نقاط پر تبادلہ خیال وایجنڈوں کے نقاط پر اتفاق وعدم اتفاق کے سینکڑوں واقعات پڑھنے کوملیں گے اگر تحقیقات کیے جائیں تو ضرور ایسے لاکھوں مثالیں ملیں گے جنکا تجزیہ کیا جاسکتا ہے دیکھا جاسکتا ہے کہ آخروقت وحالات کے مطابق ایسے مذاکرات کیوں اور کس لیے کیے جاتے ہیں انکی ضرورت ونوعیت اورنقاط کوبھی سمجھا جاسکتا ہے اورانکے پیچھے چھپے عزائم کوبھی جانا جاسکتا ہے عمومی طور پر زیادہ تر شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ہرطرح کے حالات میں فریقین کا مقصد ایسے مذاکراتی عمل سے بھی زیادہ سے زیادہ اپنے مفادات کاتحفظ ہی کرنا ہوتا ہے

مذاکراتی عمل کے نوعیت پرشکوک وشبہات کا اظہار کیا جاسکتا ہے، مذاکراتی عمل کا وقت وحالات کے مطابق غیر مناسب ہونے پر سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں ایجنڈے کے نقاط پر تحفظات کا اظہار کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ سودا بازی وساز باز کیلئے سازشیں ہوتی ہیں مذاکراتی عمل نہیں ہوتا تحفظات ہوں شکوک وشبہات یا سازشوں کا پردہ فاش کرنا ان تمام کیلئے واقعات وعلامات کو لیکر ٹھوس شواہد سامنے لانے کے ساتھ تحفظات کی وضاحت کرنا لازمی ہوجاتا ہے، اب اگر ہم اپنے قومی تحریک میں اسی تناظر سے آج کے سیاسی رجحانات کا جائزہ لیں تو ہمیں حیرت کے ساتھ ہی ساتھ شرمندگی ہوتا ہے کیونکہ سوشل میڈیا پر محمود خان اچکزئی کے اخباری بیان پر جو واویلا مچانے کی کوشش کی گئی اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو صرف اس بات کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا کہ محمود خان اچکزئی سے ملاقات کو ہی بھرپور طریقے سے جرم ثابت کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، محمود خان اچکزئی کے ایک اخباری بیان کو لیکر یار لوگوں نے سوشل میڈیا پر جو تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے اس پر میں اپنی ناقص رائے کا اظہار بعد میں کروں گا لیکن پہلے محمود خان اچکزئی کے بیان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اس اخباری بیان میں کہیں بھی محمود خان اچکزئی نے اس بات کا اقرار نہیں کیا ہے کہ وہ کسی مذاکراتی عمل کے سلسلے میں سنگت حیر بیار مری یا سلیمان داود سے ملے ہیں اور نہ ہی اس نے سرکاری نمائندگی یا پیغام رسانی کا ذکر کیا ہے پورے بیان میں عام ملاقات کے حوالے سے اپنے سیاسی گفتگو کا ذکر کیا ہے سلیمان داود سے جس حوالے سے وہ ملاقات کر چکے تھے وہ تو اسی وقت عوام کے سامنے آیا لیکن جہاں تک سنگت حیر بیار مری سے انکے ملاقات کا تعلق ہے تو اسکی حقیقت یہ ہے کہ محمود خان اچکزئی نواب خیر بخش مری کے وفات پر تعزیت کرنے کے سلسلے میں سنگت حیر بیار مری سے ملنے آئے تھے یاد رہے کہ تعزیت کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی سندھی، کشمیری، پنجابی اقوام سے تعلق رکھنے والے مختلف مکتبہ فکر لوگ سنگت حیر بیار مری سے ملاقات کر چکے ہیں بحیثیت سیاستدان محمود خان اچکزئی کا تعلق بلوچستان سے ہے اور وہ نام نہاد قوم پرستی کا دعوے دار بھی ہے پونم اور عطا اللہ مینگل کے اتحادی کے طور پر وہ قوم پرستانہ سیاست اور بلوچستان کے قوم پرست حلقوں سے قربت بھی رکھتے ہیں اور لازمی طور پر وہ قبائلی اور سماجی رسوم ودود سے واقفیت بھی رکھتے ہیں تو کسی بھی باشعور انسان کیلئے محمود خان اچکزئی کا لندن میں حیر بیار مری سے انکے والد کے وفات پر تعزیت کے لئے جانا شاہد کوئی حیرت کی بات نہیں ہو، تعزیت میں سیاسی حالات کا زیر بحث لانا اور ان پر اظہار خیال بھی غیر متوقعہ نہیں لیکن اگر اس اخباری بیان پر ڈاکٹر اللہ نذر اور اسکے دوستوں کا سوشل میڈیا پر تاثر کا جائزہ لیا جائے تو وہ سیدھی طرح سے اس تعزیتی ملاقات کو سودہ بازی وساز باز ثابت کرنے کے لیے ہڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہے، اس بات کو بھی سمجھنے میں بالکل کوئی مشکل نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ حضرات سیدھی طرح سے سنگت حیر بیار مری کے خلاف اپنے پچھلے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے تسلسل کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جس میں سنگت حیر بیار مری کو تحریک کے لیے خطرہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا آلہ کار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں بلوچ عوام میں اتنے بڑے بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کو لیکر ان حضرات نے جن اداروں اور شخصیات کے نام کا استعمال کیا وہ انکے گلے کا ہڈی بن چکا ہے کیونکہ ایسے بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کو ثابت کرنے سے ناکام رہے، لہذا اسی نفساتی دباؤ کو لیکر بغیر سوچے سمجھے یہ حضرات کسی بھی طرح اپنے ان بے بنیاد باتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی موقع ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے اس سے پہلے بھی رحمان ملک کے ملاقات پر اسی قسم کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جاچکی ہیں حالانکہ رحمان ملک سے ملاقات جس کا ذکر کھل کر الیکٹرانک میڈیا پر سنگت حیر بیار مری نے ازخود کیا تھا اس ملاقات کو لیکر ان حضرات نے جس بچگانہ طریقے سے بغلیں بجائیں اسمیں نہ ہی کسی قسم کے تحفظات کا ذکر سامنے آیا اور نہ ہی ساز باز کو لیکر کسی قسم کے واقعات وعلامات کی نشاندہی سے ٹھوس شواہد سامنے لائے گئے ماسوائے اس کے کہ رحمان ملک سے ملاقات ہی گناہ عظیم ہے یہ تمام سلسلہ پہلے سے ہی ان حضرات کے لیے جگ ہنسائی کی وجہ بن چکا ہے اور حالیہ محمود خان اچکزئی کے بیان پر اس طرح سے بغیر سوچے سمجھے سنگت حیر بیار مری پر بے بنیاد الزامات کے بوچھاڑ نے ان حضرات کے محدود سوچ سیاسی پختگی اور ذاتی ضد کے حوالے سے اور بہت کچھ واضع کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محمود خان اچکزئی کا لندن میں حیر بیار مری سے انکے والد نواب خیر بخش مری کے وفات پر تعزیت کے لئے جانا شاہد کوئی حیرت کی بات نہیں ہو، تعزیت میں سیاسی حالات کا زیر بحث لانا اور ان پر اظہار خیال بھی غیر متوقعہ نہیں لیکن اگر اس اخباری بیان پر ڈاکٹر اللہ نذر اور اسکے دوستوں کا سوشل میڈیا پر تاثر کا جائزہ لیا جائے تو وہ سیدھی طرح سے اس تعزیتی ملاقات کو سودہ بازی وساز باز ثابت کرنے کے لیے ہڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہے، اس بات کو بھی سمجھنے میں بالکل کوئی مشکل نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ حضرات سیدھی طرح سے سنگت حیر بیار مری کے خلاف اپنے پچھلے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے تسلسل کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جس میں سنگت حیر بیار مری کو تحریک کے لیے خطرہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا آلہ کار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر چکے۔

برطانوی حکومت مسلسل انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کی مذمت کرنے میں محتاط اور منتخب رویہ رکھتا آیا ہے،اور اس محتاط ومنتخب رویے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے ممکنہ اتحادیوں کو دیکھ رہا ہے۔ برطانوی حکومت پاکستان کو اس خطے میں اپنے ایک اتحادی کے طور پر دیکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ پاکستان کے خلاف کوئی ایسا بیان نہیں دے رہا یا ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا رہا جس کی وجہ سے انکے تعلقات خراب ہوں۔ میرے خیال میں یہ برطانوی حکومت کی کوتاہ بینی ہے اس کے اثرات کے نتیجے میں یہ پاکستان کو مدد اور حوصلہ فراہم کرے گی کہ وہ بلاخوف وخطر بلوچ قوم کے خلاف انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کا مرتکب ہو

برطانوی رکن پارلیمنٹ جان میکڈونل کا ھمگام کو خصوصی انٹرویو

جان میکڈونل 1951 میں پیدا ہوئے ،انہوں نے بریونل یونیورسٹی سے گورنمنٹ اور سیاسیات میں گریجویشن کی ،اسکے بعد انہوں نے اپنی ماسٹرز بربک کالج سے سیاسیات اور سماجیات میں کی۔ جان میکڈونل برطانیہ کے لیبر پارٹی کے رکن ہیں اور 1997 سے سے رکن برطانوی پارلیمنٹ ہیں۔ وہ ان چند ایک رکن برطانوی پارلیمنٹوں میں سے ایک ہیں جو ہمیشہ سے اپنے اصولوں پر عمل پیرا رہے ہے اور کئی مواقعوں پر اپنے پارٹی قیادت سے بھی اختلافات رکھتے رہے ہیں۔ جان وہ واحد انگریز رکن پارلیمنٹ تھے جو کھلم کھلا آئرش ریپبلکن آرمی کی مسلح جدوجہد کی حمایت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان لوگوں کی قدر کریں جنہوں نے مسلح مزاحمت کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ بوبی سینڈز جیسے لوگوں کی قربانی اور گولیوں ودھماکوں کی آواز ہی تھی جس نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ مذاکرات کے ٹیبل پر بیٹھے، آج ہمیں جو امن نصیب ہے وہ آئی آر اے کی مرہونِ منت ہے''

ھمگام : مغرب میں زیادہ تر لوگ بلوچستان کے بارے میں نہیں جانتے ہیں، آپ پہلی بار بلوچستان اور اسکے سیاسی حالات سے کیسے آشنا ہوئے؟

جان: مجھے پہلی بار بلوچستان کے بارے میں اس وقت پتہ چلا جب میرے حلقہ انتخاب کے کچھ ووٹرز جو اس بارے میں خدشات رکھتے تھے مجھ سے رابطہ کر کے میری توجہ اس جاری استحصال، اس میں پاکستان کا کردار اور برطانوی پالیمنٹ میں اسے آشکار کرنے کی ضرورت پر دلانی چاہی کیونکہ اس مسئلے کو برطانوی میڈیا میں بہت کم کوریج حاصل تھی اور لوگوں میں اس بابت آگاہی بھی بہت کم تھی۔

ھمگام: سنہ 2007 میں آپ برطانوی پارلیمنٹ میں واحد شخص تھے جنہوں نے بلوچ لبریشن آرمی کو دہشتگرد تنظیم قرار دینے پر اپنے پارٹی کیخلاف صدائے احتجاج بلند کی، آپ نے اس عمل کے خلاف کیوں احتجاج کیا اور ایک سیکولر مزاحمتی تنظیم پر پابندی لگانے کے پیچھے برطانیہ کے کونسے مفادات پوشیدہ ہوسکتے ہیں؟

جان : میں نے اپنے خدشات کا اظہار اسلئے کیا کیونکہ مجھے لگا پاکستانی حکومت کے کہنے پر ہی برطانوی حکومت ایک ایسے تنظیم پر پابندی لگا رہی ہے جو اپنے بنیادی حقوق اور حق آزادی کیلئے لڑ رہی ہے، مہم چلا رہی ہے اور جدوجہد کر رہی ہے۔ اسلئے میں نے سوچا کہ یہ کھلی ناانصافی ہے، میں نے یہ اہم محسوس کیا کہ کم از کم اس اقدام کیخلاف برطانوی پارلیمنٹ میں آواز بلند کی جائے۔ آج اگر لوگ برطانوی جمہوریت کا احترام کرتے ہیں تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ہم کسی بھی ایسے شخص و گروہ پر پابندی نہیں لگاتے جو اپنے سماجی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔ اس اقدام کے پیچھے برطانوی حکومت کا واحد مفاد پاکستان کو خوش کرنا تھا، اسی طرح برطانوی حکومت ایسے کئی تنظیموں کو دہشتگرد تنظیمیں قرار دیکر ان پر پابندیاں لگاتا آیا ہے جو اپنے ملکوں میں اپنے بنیادی حقوق کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں اسکی وجہ بھی صرف اپنے اتحادیوں کو خوش کرنا ہے، میرے خیال میں یہ برطانوی حکومت کی سیاسی کوتاہ بینی ہے۔

ھمگام: بلوچ قومی لیڈر حیربیار مری کو بھی لیبر پارٹی کے دور حکومت میں گرفتار کر کے بند رکھا گیا تھا، آخر اسکی وجہ کیا ہے کہ لیبر

پارٹی کی حکومت نے پاکستان کے خفیہ اشتراک سے ایک مقبول بلوچ لیڈر کے خلاف یہ قدم اٹھایا؟

جان: برطانوی حکومت ہمیشہ سے بہت محتاط رہی ہے کہ اسے کبھی دہشتگردوں کی حمایت یا انکے پرورش سے نہیں جوڑا جائے، اسلئے یہ پاکستان جیسے ملکوں کیلئے آسان بن چکا ہے کہ وہ کسی بھی شخص یا تنظیم کے بابت من گھڑت جھوٹ گڑھ کر برطانوی حکومت کو قائل کریں کہ وہ دہشتگردی میں ملوث ہے یا انکی جدوجہد تشدد و دہشت آمیز ہے۔ بنیادی طور پر ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں جن میں برطانوی حکومت نے دوسرے ممالک کے مہیا کیئے گئے جعلی معلومات کے بنیاد پر جلد نتیجہ اخذ کر کے مختلف افراد کے خلاف کاروائی کی ہے جس کے نتیجے میں مختلف لوگوں کو انصاف کے تقاضے پورے کیئے بغیر جیل میں بند کیا گیا ہے جس کے ذمہ دار وہ اتحادی ممالک ہیں جنہوں نے جعلی معلومات مہیا کی ہوتی ہیں۔

بلوچوں کی اب تحریک نوخیز ہے، دنیا میں انکے بہت سے اتحادی موجود ہو سکتے ہیں لیکن ابتک یورپی ممالک تک ان پر گذرنے والے مظالم کی وہ کہانیاں نہیں پہنچی ہیں جن سے وہ گذر رہے ہیں، لیکن میں اس عزم کا اعادہ کرتا ہوں کہ میں جتنا کر سکا ضرور کروں گا تاکہ پاکستان کے ان مظالم اور استحصال کو دنیا کے سامنے آشکار کردوں اور بتا دوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ بلوچوں کو آگے لانا پڑے گا تاکہ وہ سامنے آئیں اور اپنے مستقبل کا تعین خود کریں۔

ہمگام: برطانوی حکومت نے عراق، شام سمیت مختلف ممالک میں انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کی مذمت کی ہے لیکن بلوچستان میں پاکستان کے انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں پر کیوں برطانیہ خاموش نظر آتی ہے؟

جان: برطانوی حکومت مسلسل انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کی مذمت کرنے میں محتاط اور منتخب رویہ رکھتا آیا ہے، اور اس محتاط و منتخب رویے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے ممکنہ اتحادیوں کو دیکھ رہا ہے۔ برطانوی حکومت پاکستان کو اس خطے میں اپنے ایک اتحادی کے طور پر دیکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ پاکستان کے خلاف کوئی ایسا بیان نہیں دے رہا یا ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا رہا جس کی وجہ سے انکے تعلقات خراب ہوں۔ میرے خیال میں یہ برطانوی حکومت کی کوتاہ بینی ہے اس کے اثرات کے نتیجے میں یہ پاکستان کو مدد اور حوصلہ فراہم کرے گی کہ وہ بلاخوف وخطر بلوچ قوم کے خلاف انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کا مرتکب ہو۔ اس بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کے برطانوی حکومت سے ایک بنیادی غلطی ہو رہی ہے۔

ہمگام: پاکستان کو 2011 سے 2015 کے دوران برطانوی حکومت کی جانب سے 1.17 بلین پاونڈ کا امداد ملے گا، جو باہمی امداد کے مد میں ایک خطیر رقم ہے۔ کیا آپ اس امر کی حمایت کرتے ہیں کہ پاکستان جیسے مذہبی اور کرپٹ ریاست جو مسلسل انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں میں ملوث رہا ہے اسکی مدد برطانیہ کے عام لوگوں کے ٹیکس سے کی جائے؟

جان: ہمیں شدید تحفظات ہیں کہ برطانوی امداد کسی ایسے ملک کو ملے جو انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کا مرتکب ہو رہا ہو اور پاکستان ایسی ہی ایک ریاست ہے، اب برطانوی ارکان پارلیمنٹ تواتر کے ساتھ پاکستان کو ملنے والی امداد پر سوالات اٹھا رہے ہیں اور خاص طور پر ہم اس امداد کے استعمال اور تقسیم کے بارے میں شدید خدشات رکھتے ہیں۔ یہاں کرپشن کے مسئلے کے ساتھ ساتھ بنیادی مسئلہ یہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ آخر ایسے ملک کی امداد کیوں کی جائے جو انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں میں ملوث ہے اور اپنے وسائل کا بھی زیادہ تر حصہ اپنے فوج پر خرچ کر رہا ہے، اور وہی فوج بعد میں بلوچوں کے انسانی حقوق کے خلاف استعمال ہوتا ہے، تو یہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور برطانوی امداد کے باہم تعلق کے بنیاد پر حقیقی خدشات وجود رکھتے ہیں۔ یہ ان مسئلوں میں سے ایک ہے جسے تواتر کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے، یہاں اس بابت یہ مسئلہ بھی وجود رکھتا ہے کہ آیا یہ امداد ایک ریاست سے دوسری ریاست کو ملنی چاہیئے یا پھر وہ امداد مختلف اداروں اور سول سوسائٹی کے ذریعے خرچ کی جائے۔

ہمگام: جبری گمشدگیاں ان ہتھکنڈوں میں سے ایک ہے جو پاکستان بلوچوں کو دبانے کیلئے زور وشور سے استعمال کررہا ہے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے اعداد کے مطابق 14000 سے زائد بلوچ اس وقت پاکستانی فوج نے اغواء کرکے لاپتہ کیا ہے ان میں سے 1500 سے زائد کو قتل کرکے انکی مسخ شدہ لاشیں پھینکی جاچکی ہیں۔ مغربی ممالک اس طرز کے مسئلوں کو بہت سنجیدگی سے لیتی ہے جیسا کے ارجنٹینا میں دیکھا گیا لیکن جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے نا ہم یورپ اور نا ہی امریکہ کی طرف سے کوئی خاطر خواہ ردعمل دیکھ رہے ہیں، آپ کیا خیال میں اس نظر اندازی کے پیچھے کونسے علاقائی و بین الاقوامی محرکات کارفرما ہیں؟

جان: پاکستان کے عدم استحکام اور افغانستان میں واضح جنگ کی وجہ سے برطانیہ کے موقف کا بنیاد یہ رہا ہے کہ وہ پاکستان کو طالبان کے خلاف جنگ میں ایک اتحادی کے طور پر ساتھ رکھے گا، اس لئے وہ کسی قیمت پر پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا، اس وجہ سے وہ پاکستان کے حکومت اور فوج کے ان انسانی حقوق کے جرائم پر چشم پوشی اختیار کیئے ہوئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ایسے خبروں کی بازگشت نا برطانوی پارلیمنٹ اور نا ہی برطانوی میڈیا میں سنائی دیتی ہے اور نا ہی کبھی گمشدہ بلوچوں یا مسخ شدہ لاشوں کا کوئی تعداد ہمیں پتہ چلتی ہے۔ اب یہ مجھ جیسے ارکان پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے کہ ہم آنے والے وقت میں ایسے مسئلوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں لائیں، اور میں بذاتِ خود پارلیمنٹ کے آنے والے اجلاسوں میں اس مسئلے پر سوال اٹھاوں گا تاکہ اس مسئلے پر ایک بحث کا آغاز ہوسکے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے پاکستان اور برطانوی حکومت دونوں ان حقائق کو عام لوگوں سے چھپا رہے ہیں، میرے خیال میں برطانوی عوام اس مسئلے پر سنگین خدشات رکھیں گے حتیٰ کے میرا خیال ہے کہ برطانوی عوام اس مسئلے پر شدید غم و غصے کا اظہار کریں گے کہ برطانوی حکومت اس پاکستان سے کیوں تعلقات رکھتا ہے اور جڑا ہوا ہے جو اس وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کا مرتکب ہے، اگر ہم اس مسئلے کو برطانوی عوام کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہمیں شدید ردعمل دیکھنے کو ملے گا اور برطانوی حکومت پر بہت دباو ہوگی کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت بدل دے اور اور پاکستان پر دباو ڈالے۔ اس بابت ہر شہادت اور ہر گمشدگی کے بارے میں تحقیقات ہونا لازمی ہے۔ ہمیں اس وقت ضرورت ہے کہ اقوام متحدہ یا کوئی اور عالمی ادارہ غیر جانبدار طریقے سے ان گمشدگیوں اور شہادتوں کی تحقیقات کرکے صحیح تعداد ہمارے سامنے لائے اور ذمہ داروں کا بھی تعین کرے۔ بہرحال ہم یہی چاہتے ہیں کہ انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کے ذمہ داروں کو عالمی عدالت انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔

ہمگام: پاکستان، افغانستان اور ایران میں اب تک خواتین کا استحصال جاری ہے اور ان کی سیاسی اور سماجی حقوق کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور دوسری طرف ہم دیکھیں بلوچستان وہ خطہ ہے جہاں بلوچ خواتین بلوچ قومی جدوجہد میں ایک منفرد اور اہم کردار ادا کررہے ہیں، آپ کیا کہتے ہیں یہ امر اور آزاد بلوچستان خطے کو مستقبل میں کیسے متاثر کرے گا؟

جان: بلوچستان کی تحریک آزادی شروع دن سے ہی بنیادی طور پر انسانی اور جنسی برابری کے جدوجہد کا اظہار ہے۔ بلوچ قومی تحریک از خود اور اس میں خواتین کا کردار اس بات کا مظہر ہے کہ یہ حقیقی معنوں میں آزادی کیلئے ہے جس کی بنیاد برابری پر رکھی گئی ہے، اور بلوچ خواتین تحریک میں جو مثالی کردار ادا کررہی ہیں وہ ثابت کرتی ہے کہ ایک خاتون ہمارے سماج میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے، بلوچ قومی تحریک ہمارے سامنے ایک روشن مثال ہے کہ خواتین کس طرح اپنی طاقت سے ایک تحریک کو جلا بخش سکتی ہیں۔ یہ ظاہر کرتی ہے کہ مستقبل کے آزاد بلوچستان میں خواتین سماجی اور سیاسی سطح پر مساوی حقوق رکھیں گے۔ ہمیں ان بلوچ خواتین کو خراج تحسین پیش کرنا پڑے گا جنہوں نے جدوجہد کا راستہ اپنایا اور بلوچ تحریک میں اپنا کردار ادا کررہی ہیں۔

ہمگام: آپ آزادی پسند سیاسی کارکنان اور بلوچ عوام کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جان: سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ابتک انکی تحریک نوخیز ہے۔ دنیا میں انکے بہت سے اتحادی موجود ہوسکتے ہیں لیکن ابتک یورپی ممالک تک ان پر گذرنے والے مظالم کی وہ کہانیاں نہیں پہنچی ہیں جن سے وہ گذر رہے ہیں، لیکن میں اس عزم کا اعادہ کرتا ہوں کہ میں جتنا کرسکا ضرور کروں گا تاکہ پاکستان کے ان مظالم اور استحصال کو دنیا کے سامنے آشکار کردوں اور بتادوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ بلوچوں کو آگے لانا پڑے گا تاکہ وہ سامنے آئیں اور اپنے مستقبل کا تعین خود کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

افغان مشکلات میں اضافہ اور خودفریبی کا سراب

___ حفیظ حسن آبادی

افغان اور بلوچوں کے معاملات سنگین سے سنگین تر ہوتے جارہے ہیں کیونکہ یہ دونوں کسی بھی وقت سے زیادہ داخلی تضادات کا شکار و گومگو کی کیفیت کا شکار ہیں اور ان دونوں کے حالات خراب کرنے والی قوت ایک ہی ہے جس سے جو بات قابل تشویش ہے وہ یہ کہ اگران کے حالات میں بہتری نہیں آئی تو مستقبل قریب میں ان کے مسائل مزید گھمبیر ہوں گے ہی لیکن ساتھ میں امریکہ، بھارت، روس اور خطے کے دیگر ممالک کیلئے بھی نئے مسائل کھڑی ہوسکتی ہیں۔ایسے حالات میں کسی بھی وقت سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ افغان و بلوچ متعلق بڑی قوتوں اور علاقائی قوتوں سمیت ان کی اپنی پالیسیاں دوٹھوک اور ہر لحاظ سے واضح ہوں۔اس مایوس کن حقیقت حال کے باوجود یہ حوصلہ افزاء امر قابل توجہ رہے کہ ان کے پاس حالات کو اپنے حق میں تبدیل کرنے دشمن کے مقابلے میں زیادہ امکان موجود ہے۔

☆۔افغان پاکستان دوستی کی خوش فھمی

ہمیں یہ بات کہنے میں زرا بھی جھجک محسوس نہیں ہورہا کہ پاکستان کیساتھ دوستی بڑھانے کی افغان قیادت کی خواہش زمینی حقائق کے منافی اور خودفریبی کے سوا کچھ نہیں جس طرح داؤد خان، نور محمد ترکئی، ببرک کارمل ڈاکٹر نجیب اللہ اور برہان الدین ربانی و احمد کرزئی کی پاکستان سے اچھے ہمسایوں جیسے تعلقات کی خواہش حقیقت نہ بن سکی اشرف غنی کی دوستی کی اُمیدیں بھی پوری نہیں ہوسکتیں۔ماضی میں افغانوں کی طرف سے دوستی و آشتی کی خواہش یکطرفہ رہی ہے اب بھی یکطرفہ ہے پاکستان نے ماضی میں افغان امن خواہش کو سبوتاژ کرنے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اب بھی اُس کے ارادے اور تیاریاں یہی ہیں۔

تمام افغان حکمرانوں سے زیادہ بہتر صرف دو حکمران شہید ڈاکٹر نجیب اللہ اور احمد کرزئی نے پاکستان کو اس کی تمام تر ریشہ دوانیوں کیساتھ سمجھا اور اس کے خلاف عملی طور پر کچھ کرنے کوشش کی مگر دونوں کیساتھ دو مختلف المیہ پیش آئے جو وہ پاکستانی سازشوں کا منہ توڑ جواب نہیں دے سکے۔شہید ڈاکٹر نجیب اللہ پاکستان بارے یکسو تھا مگر اُس وقت قوم پر مجاہدین کا خمار چڑھ چکا تھا جو پاکستان بارے آج کی طرح آگاہ نہیں تھی۔اُن کا تذبذب مرکزی قیادت کو فیصلہ کن جنگ سے روک رہی تھی اس کے علاوہ افغانوں کا فطری اتحادی بلوچ اور پشتون آزادی کے فیصلہ کن جنگ کیلئے آمادہ نہیں ہوئے کہ جس سے افغانوں کو اپنے معاملات درست کرنے میں مدد ملتی اُوپر سے سوویت یونین نے بھی بیچ راہ میں چھوڑ دیا کرزئی کا المیہ اور بھی بھیانک تھا کیونکہ اس کے وقت وہ بطور لیڈر اور افغان قوم دونوں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان ہمیں آباد دیکھنا نہیں چاہتا بلوچ بھی آزادی کے فیصلہ کن جنگ کیلئے میدان میں بی ایل اے کی سربراہی میں اُتر ابعد میں دیگر آزادی پسند عسکری تنظیمیں جنگ کا حصہ بنیں مگر اُنھیں پاکستان بارے امریکی دوغلی پالیسی نے فریاد و شکایت کرنے سے بڑھکر کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔شہید ڈاکٹر نجیب اللہ کی ویژن کو جس طرح اُسکی زندگی میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اِسی طرح آج بھی وہی رویہ برقرار ہے جو افغان قیادت اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی پاکستان سے خیر کی توقع کئے بیٹھا ہے۔جیسے کہ اُوپر کہا جا چکا کہ یہ رویہ شروع سے ہی رہا ہے جس سے افغانستان بُری متاثر بھی ہوا ہے لیکن اب جب افغانستان ایک ٹرانزیشن پیریڈ (transition period) سے گذر رہا ہے ایسے شش و پنج کے اثرات تباہ کن ہوسکتے ہیں کیونکہ ایسے حالات میں کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر مستقل اور ٹھیک طریقے سے نہیں بیٹھا ہوتا جو بیرونی مداخلت و ریشہ دوانیاں کرنے والی قوتوں کیلئے سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔افغان مسئلہ بارے سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اُس کے مطابق دونوں بڑی طاقتیں پاکستان سمیت افغانستان کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔مگر بعد میں امریکہ اور پاکستان اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکے اور مجاہدین کی مدد جاری رہی۔جبکہ سوویت یونین نے معاہدے کی پاسداری کی یا بھاگنے کا موقع پا کر ایسے نکلا کہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا نتیجے میں ڈاکٹر نجیب اللہ یک و تنہا رہ گیا۔آج امریکہ اور اتحادی گو کہ افغانستان کو اُس طرح تنہا نہیں چھوڑ رہے ہیں لیکن اُنھیں کسی سے بھی زیادہ اس بات کا علم ہے کہ وہ جس حساب اور جس نوعیت کی مدد جاری رکھیں گے وہ افغانستان کو دلدل سے نکالنے کیلئے ناکافی ہے۔اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ افغان قیادت اور امریکی حکام کو بہت جلد اس بات کا احساس ہوگا کہ پاکستان نے ضرب عضب کے پیچھے خود کو تمام زمہ داریوں سے بری الذمہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔افغان قیادت اور امریکہ شروع سے پاکستان سے انتہا پسندوں کو بات چیت کے میز پر لانے اور اُن پر اثرانداز ہونے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں لیکن اس آپریشن کے بعد وہ ایسا مطالبہ نہیں کرسکتے کیونکہ پاکستان کے پاس اس آپریشن کی وجہ سے پہلے سے خراب تعلقات مزید

افغان مسئلہ بارے سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اُس کے مطابق دونوں بڑی طاقتیں پاکستان سمیت افغانستان کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ مگر بعد میں امریکہ اور پاکستان اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکے اور مجاہدین کی مدد جاری رہی۔ جبکہ سوویت یونین نے معاہدے کی پاسداری کی یا بھاگنے کا موقع پا کر ایسے نکلا کہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا نتیجے میں ڈاکٹر نجیب اللہ یک وتنہا رہ گیا۔ آج امریکہ اور اتحادی گو کہ افغانستان کو اُس طرح تنہا نہیں چھوڑ رہے ہیں لیکن اُنھیں کسی سے بھی زیادہ اس بات کا علم ہے کہ وہ جس حساب اور جس نوعیت کی مدد جاری رکھیں گے وہ افغانستان کو دلدل سے نکالنے کیلئے ناکافی ہے۔

خراب ہوگئے ہیں اور وہ قائدین جو پہلے کسی نہ کسی طرح اُن سے رابطے میں تھے اب علاقہ چھوڑ کر افغانستان یا کہیں اور چلے گئے ہیں ۔ پاکستان نے اپنے بری الذمہ ہونے کے تاثر دینے کی ابتداء مکمل تیاری کیساتھ چین کو درمیان میں لانے کی صورت میں کیا جہاں افغان صدر کے دورہ چین کے فوراً بعد طالبان لیڈر قاری دین محمد کو بیجنگ میں خوش آمدید کہا گیا اور مذکورہ دورہ بارے یہ اُمید ظاہر کیا جا رہا کہ چین افغانستان میں قیام امن کیلئے طالبان اور افغان قیادت کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرے گا۔ بظاہر یہ ایک خوش آئند پیش رفت ہے مگر اس کے نتائج منفی صفر ہی برآمد ہوں گے کیونکہ اگر طالبان پاکستانی پاسپورٹ پر سفر کر کے اُس کی مات نہیں مانتے تو چین کی کیا مانیں گے۔ افغان اور امریکی حکام اگر چین ثالثی پیش رفت پر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو ہو جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ پاکستان جو کام سو فیصد خود کر سکتا ہے نہیں کرنا چاہتا بلکہ چین کو درمیان آ کر وقت کا زیاں چاہتا ہے یا اس کا مطلب عام الفاظ میں یہی ہے کہ جو چیز آپ کیلئے وجہ تشویش ہے اُس میں ہم آپکی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس جواب کے پیچھے جو تلخ حقیقت پنہاں ہے وہ یہ کہ افغانستان کا امن برباد کرنے والی شدت پسند قوتیں 2015 سے پہلے افغانستان منتقل ہو چکے ہیں جو افغانستان میں اقتدار کے کھینچا تانی اور غیر یقینی صورتحال کا بھرپور فایدہ اُٹھا کر اگلے بہار آنے سے تک ہر طرف تباہی پھیلانے اپنی پوری تیاری مکمل کرلیں گے۔ اگر اکتوبر 2014 سے لیکر اگلے چھ سات ماہ تک اشرف غنی کی حکومت پاکستان سے خیر کی توقع میں واضع پالیسی اپنانے ناکام ہوگی تو اُنھیں اس مدت کے بعد اُن کے مشکلات میں بہت اضافہ احساس ہوگا۔ پاکستانی پشت پناہی میں سرگرم شدت پسند اُس وقت تک اشرف غنی کی منتظرانہ پالیسی کا بھرپور فایدہ اُٹھا کر اُسے یہ سوچنے مجبور کریں گے کہ اُس نے پاکستان سے جو توقعات رکھے تھے اُن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ آج کے دھیمے لہجے میں بات کرنے والے نئے افغان صدر کے بیانات مستقبل قریب میں احمد کرزئی کے بیانات سے کہیں زیادہ سخت ہوں گے امریکہ کے برہمی میں اضافہ ہوگا۔ اس وقت جو سوال سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ افغان قیادت اس چیز کا ادراک رکھتی ہے کہ اس کے داخلی گومگو کی کیفیت اُس کے اداروں کی کارکردگی کو متاثر کر کے اُس کے دشمنوں کو موافق موقع فراہم کرے گی؟ اور کیا یہی بات امریکی حکام اسی طرح سمجھتے ہیں کہ پاکستان آئندہ نہ صرف اُنکی مدد نہیں کرے گا بلکہ ان کے کئے پر پانی پھیرنے زوروں سے تیاریاں کر رہا جسکی ابتدائی اثرات بالعموم افغانستان اور بالخصوص کابل میں حملوں میں تیزی کی صورت میں نظر آ رہا؟ ۔ اور کیا وہ اس سارے معاملے میں بلوچ فیکٹر کو سنجیدگی سے لیکر اُسے اپنے جز وقتی مفادات کیلئے ایک پریشر قوت سے بڑھ کر اہمیت دینے اور اُسے اُس کے قومی مفادات کے تناظر میں بنائے گئے پالیسیز کو آگے لے جانے کوئی رکاوٹ تو نہیں کھڑی کریں گے؟ اور خود بلوچ قیادت اس سارے کھیل میں جو اُس کے ساحل و وسائل پر قبضہ جمانے جاری ہے اس قابل ہے کہ دنیا کو یہ باور کرائے کہ وہ کرائے کا سپاہی نہیں بلکہ ایک مضبوط اسٹیک ہولڈر ہے اور وہ کسی کی پراکسی وار کا حصہ نہیں بلکہ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا اور دنیا اُسے اسی تناظر میں سنجیدگی سے لے؟ اس مختصر بحث میں جو چیز قابل تشویش ہے وہ یہ کہ ان میں کسی ایک سوال کا جواب بھی مطلق مثبت نہیں افغان قیادت کے دونوں دھڑے بظاہر مسکراہٹوں کے تبادلے میں بے مثال ہیں لیکن حقیقی طور پر اُنھیں اس سے بڑھکر بہت کچھ کرنا ہے جسکی کم از کم ابتداء کابینہ کی تشکیل کے بعد اشتراک عمل کا قابل عمل فارمولہ ہے۔ افغانستان جیسے ملک میں جہاں جون کو الیکشن ہوئے تین مہینے تک دوبارہ گنتی اور الزامات میں گذر گئے ستمبر کے آخر میں دونوں صدارتی اُمیدوار آپس میں بیٹھنے راضی ہوئے مگر اب تک باہمی ہم آہنگی اور اشتراک عمل کے فقدان کا تاثر زائل نہ ہو سکا ہے اور حالات کے رفتار سے یہی عندیہ ملتا ہے کہ یہ کشمکش درون خانہ ہنوز جاری ہے۔ امریکی اور اس کے اتحادی اس سے بھی زیادہ مشکل میں گرے نظر آتے ہیں جو اُن کے کمانڈرز آج بھی یہ بیانات دیتے ہیں کہ افغان سیکورٹی فورسز کی تربیت نئے خطوط پر ہونی چاہئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے سال افغانستان میں رہ کر یہ بنیادی کام کرنے کیا امر مانع رہی؟ جواب جاتے جاتے اسکی ضرورت محسوس کی جا رہی۔ پاکستان بارے

امریکہ اور اتحادی ہر چیز جاننے کے باوجود بدترین مغالطے اور تذبذب کا شکار ہیں جو اُنھیں اس ملک بارے فیصلہ کن قدم اُٹھانے نہیں دے رہی۔

☆۔ بلوچ کے یکسوئی کی ضرورت

جس طرح افغان قیادت کو کسی بھی وقت سے زیادہ اس بات کی طرف دھیان دینا ہے کہ اُن کے مسلے کا حل صرف اُنہی کو ڈھونڈ نا ہے اسی طرح بلوچوں کو بھی یہ جاننا چاہیئے کہ اپنے مسلے کے حل بارے سب سے پہلے اُنھیں اپنی سنجیدگی اور دلچپسی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ دنیا اور علاقے کی امن وسلامتی کیلئے افغانستان میں قیام امن اور مستحکم آزاد بلوچستان کا وجود ضروری ہے مگر دنیا اور علاقائی قوتیں اُس وقت بہت کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے جب تک افغان قیادت اور بلوچ قیادت اپنے معاملات کے سنگینی کے مطابق اپنی حکمت عملی بنا کر اُس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ اگر افغان قیادت اپنے اہمیت کے مطابق امریکہ و دنیا کی مدد سے فاہدہ اُٹھانے کامیاب ہوکر اپنے ملک میں امن نہیں لا سکی ہے تو بلوچ قیادت بھی دنیا کو یہ باور کرانے کامیاب نہیں ہوسکی ہے کہ آئندہ کا آزاد بلوچستان داخلی انتشار کی بھینٹ چڑھ کر ایک اور صومالیہ نہیں بنے گا۔ جس کیلئے اس وقت بلوچ قیادت کو اپنے کام آسان اور بہتر بنانے کیلئے فقط تین شعبہ جات پر بھرپور اور مربوط توجہ دینے کی ضرورت ہے پہلے اپنے دفاعی شعبے کو مضبوط کرنا چاہیئے جس سے بلوچ وطن میں کسی اور کی حاکمیت ناممکن ہونے کیساتھ عام بلوچ کا قتل آسان نہ ہو دوسرا انسانی حقوق کی پائمالیوں پر اُس کی شدت کے مطابق آواز بلند کرکے وہاں کی سول سوسائٹی اور دنیا کو متوجہ کرنا تیسرا بین القوامی سفارتکاری کو موثر بنا کر اُسے عالمی معیار تک لانے کی سعی کرنا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں سرفیس کی سیاست پر توجہ دینا اپنا وقت وتوانائی ضائع کرنے کے مترادف۔ اس ضمن میں یہ مثال اب کافی پرانا ہوچکا مگر اُس کی افادیت آج بھی روز اول کی طرح مسلم ہے اس لئے اِسے پھر سے تکرار کرتے ہیں کہ افغانستان میں تین بڑی جنگیں دو سپُر پاورز کیساتھ تسلسل کیساتھ لڑی گئیں تین نظام تبدیل ہوئے سوویت یونین بدترین شکست کے بعد واپس ہوا امریکہ اتحادیوں سمیت کھربوں ڈالر خرچ کرنے کے بعد بھی اصل مسلہ کے حل سے کوسوں دور ہے اس تمام عرصے میں کمیونسٹ نواز حکومت کے خلاف دوَراں جنگ کبھی بھی مجاہدین کے حق میں نہ کوئی ریلی نکالی گئی نہ جلسہ جلوس کیا گیا نہ سیمینار زمنعقد کئے گئے، طالبان کے مخالف بھی جلسہ جلوس کے زریعے اقتدار تک نہ پہنچ سکے اور نہ اب افغانستان میں طالبان کے حق میں کہیں جلسہ جلوس کیا جارہا۔ اگر امریکہ اور اتحادی افغانستان کیساتھ ملا عمر اور طالبان سے بات چیت کیلئے بیقرار ہیں اُسکی وجہ یہ نہیں کہ اُسکے حق میں بڑی ریلیاں نکلتی ہیں بلکہ یہ کہ اُس نے کاروبار زندگی کو متاثر کرکے یہ یقین دلانے کامیاب ہوا ہے کہ اُس کی مرضی کے بغیر ریاستی رٹ قائم رکھنا مشکل ہے۔ بلوچ ایک جلا دصفت ریاست سے مہذب سیاسی رویے کی توقع کرکے خودکشی کی کوشش نہ کرے بلکہ اپنے حالات کو بہتر سمجھتے ہوئے اپنی نئی حکمت عملی ترتیب دے جس کے تحت تمام سیاسی سرگرمیاں بیرون ملک منتقل ہوں ملک میں وہی سرگرمیاں جاری رہیں جن پر ریاست کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہوسکے۔ بلوچستان کی آزادی بلوچ کیساتھ دنیا کی بھی ضرورت ہے مگر اسے دنیا کو سمجھانا اور یقین دلانا ہوگا اور یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہوگا کہ ملک کے اندر عسکری وانسانی حقوق کے شعبوں میں سرگرم عناصر ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوں اور بیرون ملک سفارتی وسیاسی سرگرمیاں ہماری داخلی تضادات کے زیر اثر دنیا کو مخمصے کی کیفیت سے دوچار کرکے بلوچ مسلہ کو نظر انداز کرنے کا سبب نہ بنیں۔

افغان اور بلوچوں کے معاملات سنگین سے سنگین تر ہوتے جارہے ہیں کیونکہ یہ دونوں کسی بھی وقت سے زیادہ داخلی تضادات کا شکار وگومگو کی کیفیت کا شکار ہیں اور ان دونوں کے حالات خراب کرنے والی قوت ایک ہی ہے جس سے جو بات قابل تشویش ہے وہ یہ کہ اگر ان کے حالات میں بہتری نہیں آئی تو مستقبل قریب میں ان کے مسائل مزید گھمبیر ہوں گے ہی لیکن ساتھ میں امریکہ، بھارت، روس اور خطے کے دیگر ممالک کیلئے بھی نئے مسائل کھڑی ہوسکتی ہیں۔ ایسے حالات میں کسی بھی وقت سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ افغان و بلوچ متعلق بڑی قوتوں اور علاقائی قوتوں سمیت ان کی اپنی پالیسیاں دوٹھوک اور ہر لحاظ سے واضع ہوں۔ اس مایوس کن حقیقت حال کے باوجود یہ حوصلہ افزاء امر قابل توجہ رہے کہ ان کے پاس حالات کو اپنے حق میں تبدیل کرنے دشمن کے مقابلے میں زیادہ امکان موجود ہے۔

سوشل میڈیا کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ فیس بک پر موجود لوگوں کو اگر ایک ملک کی آبادی کے مطابق جانچا جائے تو یہ دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جاتا ہے۔سوشل میڈیا کے اثر انگیزی کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کے مشہور گلوکار جسٹن بیبر ،کیٹی پیری اور لیڈی گاگا کے ٹوئٹر فالوورز جرمنی ،ترکی ،جنوبی افریقہ ،ارجنٹائن ،مصر اور کینیڈا کی آبادی سے زیادہ ہیں یعنی جب ان اشخاص کی آواز کسی ملک کے صدر سے بھی زیادہ سنی جاتی ہے۔اتنی بڑی آبادی کی موجودگی میں سوشل میڈیا کاروباری افراد اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو بہت سے مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ یہاں پہ اپنے پروڈکٹ کے اشتہاروں کی تشہیر کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوشل میڈیا اور بلوچ قومی تحریک

گدران بلوچ

سوشل میڈیا کے اصطلاح کا استعمال سنہ 1999 میں سامنے آیا اور اس اصطلاح کو پیش کرنے والے دعوے دار بھی بہت ہیں۔سوشل میڈیا سے مراد انٹرنیٹ بلاگز ،سماجی رابطوں کی ویب سائٹس اور دیگر موبائل ایپس جو انٹرنیٹ سے منسلک ہوں شامل ہیں۔مختلف شعبوں سے منسلک افراد اپنے کام کے نوعیت کے مطابق سوشل میڈیا کا کوئی مختلف ذریعہ منتخب کرتے ہیں مثلاً ایک لکھاری اپنے تحریریوں کیلئے بلاگ کا استعمال کرتا ہے اور انٹرنیٹ بلاگز لکھتا ہے یا دوستوں اور اپنے گرد کے مخصوص حلقے سے رابطے میں رہنے کے لیئے فیس بک کا استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح مشہور اشخاص عوام کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیئے ٹویٹر کا استعمال کرتے ہیں اور پروفیشنل لوگ اپنے شعبے کے افراد کے ساتھ تعلق رکھنے کیلئے لنکڈان کا استعمال کرتے ہیں ،یعنی سوشل میڈیا کے مختلف آلات یا چہروں کا استعمال مختلف مقاصد کے لیئے ہوتا ہے۔یعنی سوشل میڈیا نے پہلی بار انسانی رابطوں کو ایک محدود حلقے سے نکال کر عالمی اور قومی کر دیا اور تاریخ میں پہلی بار خبر عوام کے ہاتھ میں آگئی اور اسی طرح یہ تاریخ میں پہلی بار ہے کہ ایک عام انسان اپنا رائے اتنی آسانی سے اتنے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکتا ہے اور تبدیلی لا سکتا ہے۔سوشل میڈیا کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ فیس بک پر موجود لوگوں کو اگر ایک ملک کی آبادی کے مطابق جانچا جائے تو یہ دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جاتا ہے۔سوشل میڈیا کے اثر انگیزی کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کے مشہور گلوکار جسٹن بیبر ،کیٹی پیری اور لیڈی گاگا کے ٹوئٹر فالوورز جرمنی ،ترکی ،جنوبی افریقہ ،ارجنٹائن ،مصر اور کینیڈا کی آبادی سے زیادہ ہیں یعنی جب ان اشخاص کی آواز کسی ملک کے صدر سے بھی زیادہ سنی جاتی ہے۔اتنی بڑی آبادی کی موجودگی میں سوشل میڈیا کاروباری افراد اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو بہت سے مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ یہاں پہ اپنے پروڈکٹ کے اشتہاروں کی تشہیر کریں۔سوشل میڈیا میں دیگر چیزوں سے زیادہ سماجی رابطوں کی ویب سائٹس کی جانب لوگوں کا رجحان زیادہ ہے جن میں فیس بک ،ٹویٹر ،انسٹاگرام وغیرہ ہیں۔فیس بک کے بانی کے مطابق ہر ماہ 1.39 بلین لوگ فیس بک سے جڑتے ہیں اور 300 ملین لوگ انسٹاگرام سے۔اتنی بڑی آبادی کی موجودگی میں اپنی آواز پہنچانا آسان بلکہ تیز بھی ہو گیا ہے مثال کے طور پہ اگر ٹیوٹر پہ آپکے 100 فالورز ہیں اور آپکے ٹویٹ کو کوئی ایسا شخص ریٹویٹ یعنی شیئر کرتا ہے جس کے فالور ہزار ہوں تو ایک منٹ کے اندر آپکے الفاظ 1100 لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔یقیناً اس رفتار کو دیکھ کے بہت سے لوگ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے زیادہ سوشل میڈیا کو ترجیح دینے لگیں ہیں جہاں آپکو دنیا بھر کی معلومات منٹوں میں ملتی ہے وہ بھی بغیر کسی توڑ مروڑ کے۔سوشل میڈیا شروعاتی دنوں میں محض شغل کا سامان تھا مگر اسکی مقبولیت کے بعد آہستہ آہستہ کاروبار کا سامان بھی بن گیا مگر جب عام لوگ اور سیاسی کارکنان و پارٹیاں سوشل میڈیا سے جڑنے لگے تو پھر سوشل میڈیا نے آنے ولے دنوں میں ایک ایسا کردار نبھایا جس کی امید شاید ہی کسی کو تھا ،وہ کردار اپنے انقلابی نظریات کی پرچار تھی۔جب عام عوام سوشل میڈیا کے ذریعے سے آپس میں جڑنے لگے تو فطری طور پر ایک عام انسان کے مسائل بھی زیر بحث آئے ،ان مسائل پر ہم فکر اکھٹا ہوتے رہے ،سیاسی نظریات کا تبادلہ ہوتا گیا اور وہ عوامی جذبات وخیالات جو سرکاری میڈیا دباتے آ رہی تھی وہ سوشل میڈیا کے توسط سے اپنا اظہار

کرتے گئے اوران حقائق کے بنیاد پرتحریکیں شروع ہوئی۔

☆۔ تیونیس کا انقلاب

مشرق وسطی میں موجود عرب ملک تیونیس پر 1987 سے صدر زین العابدین قابض تھے جو کامیابی سے اپنے خلاف ہراحتجاج کو طاقت سے دباتا آرہا تھا،حکومت مخالف کوئی بھی تحریک چھوٹی یا بڑی2010 سے پہلے تک جڑ پکڑ نہیں پائی تھی نا ہی میڈیا انھیں کوریج دیتا تھا مگر سنہ 2010 میں ایک غریب عرب سبزی فروش کی خودسوزی نے ہنگامہ برپا کردیا ،محمد بوعزیزی اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا اور ہاتھ گاڈی چلا کراس پر سبزیاں بیچتا تھا مگر ایک دن پولیس نے اسکی ہاتھ گاڑی ضبط کردی،اپنے دفاع کے لیئے بار بار پولیس تھانہ جانے پر اسے گالیاں سننے کو ملتی۔جب اس کے انصاف کی امیدوں نے دم توڑ دیا تو بوعزیزی نے بنا کسی کو بتائے پولیس ہیڈکوارٹر کے سامنے خود پر تیل چھڑک کرخودسوزی کردی۔اس عمل کے نتیجے میں ملک بھر میں حکومت مخالف تحریک برپا ہوا عوام سڑکوں پر نکل آئی اور سول نافرمانی شروع ہوگئی،پچھلے احتجاجوں کے برعکس اس بار تیونس کا عوام سوشل میڈیا کے زریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھا اور مین اسٹریم میڈیا میں کوریج نہ ہونے کے باوجود احتجاج کی ہرتصویر اور ویڈیو سوشل میڈیا کے فیس بک اور یوٹیوب پہ پھیل رہی تھی پوری دنیا احتجاجوں پر حکومتی ظلم کی مذمت کرنے لگا۔اس انقلاب کو سوشل میڈیا نے مضبوطی دی اور صدر زین العابدین کو جھکنے پر مجبور کردیا بالآخر صدر نے 2011 میں استعفیٰ دے دیا۔تیونس کا انقلاب سوشل میڈیا کی مدد لینے والا پہلا انقلاب تھا اسکے بعد انقلابات کا جو سلسلہ شروع ہوا اسے آج ہم عرب بہار کے نام سے جانتے ہیں۔

☆۔ انقلابِ مصر

عرب بہار کی کڑی میں دوسرا انقلاب 2011 میں مصر کا تھا جہاں صدر حسنی مبارک دہائیوں سے قابض تھا۔حسنی مبارک بھی دیگر آمروں کی طرح اظہار رائے پر قدغن لگاتا آرہا تھا اور ہر طرف طاقت کا استعمال کرتا تھا۔اسی طرح طاقت کے استعمال کا شکار ایک عام مصری شہری خالد سعید بنا جسے اسکندریہ کی پولیس نے ازیت ناک موت دی تھی۔مگر ماضی کی طرح اس بار یہ قتل چھپ نہ پائی دبئی میں مقیم مصری شہری وایل غنیم کی نظر سے جب خالد سعید کی مسخ لاش کی تصویر گزری تو اس نے اپنے غصے کے اظہار کے لیئے فیس بک پر ایک صفحہ بناڈالا جسکا نام اسنے ہم سب خالد سعید ہیں رکھا اور لکھا کہ آج خالد قتل ہوا ہے کل ہم سب کی باری ہے۔دیکھتے ہیں دیکھتے اس صفحے کو پسند کرنے والوں کی آبادی بڑھتی گئی اور ایک دن میں 350 اور تین مہینے میں 2500000 ہوگئی۔غنیم نے سوشل میڈیا کی توسط سے لوگوں کو منظم کیا اور احتجاجوں کے لیئے وقت اور جگہ کا تعین کیا۔

لوگ مشہور زمانہ تحریر اسکوئر پر جمع ہوئے،شروع میں لوگ جمع ہو کے صرف خالد سعید کی یاد میں خاموشی اختیار کرتے اور مارچ کرتے،مصر میں وایل غنیم کے حکومتی اداروں کے اغوا کے بعد احتجاجوں میں شدت آئی اور حکومت کو مجبوراً غنیم کو منظر عام پر لانا پڑا۔اب کی بار احتجاجوں کا سلسلہ حسنی مبارک کے استعفےٰ تک چلا۔حکومت کے حامیوں اور مخالفوں میں تصادم ہوتے رہے اور تیونس کی طرح یہاں بھی سوشل میڈیا ہی مظلوم عوام اور انقلاب کی آواز بنی۔بالآخر صدر حسنی مبارک نے 10 فروری 2011 کو استعفیٰ دے دیا۔سوشل میڈیا کے توسط سے پذیرائی حاصل کرنے والا یہ عرب بہار آج بیشتر عرب ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، لیبیا،شام،عراق،بحرین،یمن اور لبنان سب کے سب عوامی تحریکوں میں گھری ہوئی ہے۔سوشل میڈیا کی اہمیت پوری دنیا نے تسلیم کی ہے اور ہر مظلوم قوم نے اسے اپنی آواز پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے،کردوں کی تحریک ہو یا تاملوں کی،باسق کی ہو یا تبتیوں کی سب اپنی حالتِ زار سوشل میڈیا میں پیش کررہے ہیں اور دنیا کو قابض ممالک کے ظلم وجبر کی تصاویر دکھارہے ہیں اور ناانصافیوں کے داستان لکھ رہے ہیں۔جیسے دنیا کی تمام مظلوم اقوام سوشل میڈیا کا سہارا لے رہی ہے اپنی آواز پہنچانے کے لیئے اسی طرح بلوچ قوم بھی سوشل میڈیا پہ متحرک ہے۔ بلوچ سوشل میڈیا ایکٹیوسٹس آج ہمیں سماجی رابطوں کی ہر ویب سائٹ پہ نظر آتے ہیں خواہ وہ فیس بک ہو،ٹویٹر ہو،یوٹیوب ہو یا پھر انسٹاگرام۔بلوچ

سوشل میڈیا کی اہمیت پوری دنیا نے تسلیم کی ہے اور ہر مظلوم قوم نے اسے اپنی آواز پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے،کردوں کی تحریک ہو یا تاملوں کی،باسق کی ہو یا تبتیوں کی سب اپنی حالتِ زار سوشل میڈیا میں پیش کررہے ہیں اور دنیا کو قابض ممالک کے ظلم وجبر کی تصاویر دکھارہے ہیں اور ناانصافیوں کے داستان لکھ رہے ہیں۔جیسے دنیا کی تمام مظلوم اقوام سوشل میڈیا کا سہارا لے رہی ہے اپنی آواز پہنچانے کے لئے اسی طرح بلوچ قوم بھی سوشل میڈیا پہ متحرک ہے

ایکٹیوسٹس منظم انداز سے سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے بلوچستان میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو دنیا کے سامنے رکھتے آرہے ہیں، آج اگر مشکے کے دیہاتوں میں آپریشن ہوتا ہے تو بلوچ ایکٹویسٹس آپریشن کے بعد کی تباہ کاریوں کی تصویر سوشل میڈیا میں پھیلا دیتی ہیں اور دنیا کو دکھاتے ہیں کہ کس طرح قابض پاکستان غریب بلوچوں کے گھروں کو مسمار کررہا ہے۔ بلوچ ایکٹوٹس نے صرف فیس بک اور ٹویٹر پہ اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بہت سے بہترین نیوز ویب سائٹس بھی چلا رہے ہیں جن کے قارئین میں ملکی اور غیر ملکیوں کی کثیر تعداد شامل ہے قابل ذکران نیوز ویب سائٹس میں ہمگام نیوز اور بلوچ ورنا نیوز ہیں جہاں روزانہ کی بنیاد پہ بلوچستان میں رونما ہونے والے خبروں کے ساتھ ساتھ تجزیہ اور تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔اسی طرح بلوچ مسنگ پرسنز کی ویب سائٹ بھی موجود ہے جہاں بلوچ لاپتہ افراد کی پوری معلومات درج ہیں کہ کب کسے کس وقت لاپتہ کیا گیا اور ان معلومات تک پوری دنیا کو رسائی حاصل ہے۔ان اہم ویب سائٹس کے ساتھ ساتھ ہمیں بلوچ سوشل میڈیا ایکٹیوسٹس ایسوسی ایشن کا ایک بلاگ بھی ملتا ہے جہاں بلوچ ایکٹوسٹس مختلف مہموں کے حوالے سے عنوان اور وقت شائع کرتے ہیں جن کو مدنظر رکھ کر سوشل میڈیا پہ موجود بلوچ ٹویٹر پہ ایک مخصوص ہیش ٹیگ کا استعمال کرتے ہوئے اپنا احتجاج درج کرتے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں چین کی بلوچ سرزمین پہ موجودگی کے خلاف ٹویٹر کیمپین چلا جس کی ٹوٹل ریچ یعنی احتجاج کو دیکھنے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ بلوچ قومی تحریک میں سوشل میڈیا کا استعمال میری نظر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہاں ناصرف دشمنوں کے ظلم وجبر کو دنیا کے سامنے رکھا جارہا ہے بلکہ بہت سے بلوچ اندرونی خامیوں کو بھی بلوچ عوام کے سامنے رکھ رہی ہے۔وہ اس طرح کے بلوچ تحریک کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ رد انقلابی بھی زور پکڑتے جارہے تھے اور تحریک کو مختلف گروہوں میں بانٹ رہے تھے۔پس پشت ہونے والے اختلافات قوم کی نظروں سے اوجھل تھے اور ماضی میں مضبوط بلوچ قومی تحریک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہی تھی جس کی وجہ ایک عام بلوچ کو

بلوچ قومی تحریک میں سوشل میڈیا کا استعمال میری نظر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہاں ناصرف دشمنوں کے ظلم وجبر کو دنیا کے سامنے رکھا جارہا ہے بلکہ بہت سے بلوچ اندرونی خامیوں کو بھی بلوچ عوام کے سامنے رکھ رہی ہے۔

تب تک پتہ نہ چل سکی جب تک بلوچ دانشوروں وجہد کاروں نے اس بات کو فرض نہیں سمجھا کہ اندرونی حالات سے قوم کو آگاہ کیا جائے اور اس سلسلے میں انھوں نے سب سے موزوں میڈیا کا انتخاب کیا جو کہ سوشل میڈیا تھی اور یہاں پہلے سے بلوچ آزادی کے جہد سے تعلق رکھنے والے ایکٹیوسٹس کی بھی کثیر آبادی موجود تھی۔ 2013 میں اندرونی خامیوں کے اوپر کالم لکھے جانے لگے اور مختصر مضامین بھی بلاگز اور فیس بک پر شیئر کیئے جانے لگے جہاں مختلف رد انقلابیوں کے اصلیت واضح کی گئی اور قوم کو آگاہ کیا گیا کہ ایسے اعمال جو بظاہر ہمیں انقلابی لگتے ہیں مگر حقیقت میں ہمیں مزید غلامی کے زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔بلوچ تحریک میں ان رفارمر یعنی اصلاح لانے والوں نے بھی سوشل میڈیا کی اہمیت کو جان کر یہاں آئے روز تنقیدی مضامین شائع کررہے ہیں جن کی وجہ صرف تین سالوں میں بلوچ قومی تحریک میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئے ہیں۔عوامی حلقوں کی رائے میں ان تنقیدی مضامین کی وجہ سے انھیں بہت سے لوگوں کی اصلیت اور زہنیت پتا چلی ہے جنھیں وہ انقلابی ہیرو سمجھتے تھے۔یہ تنقیدی مضامین سوشل میڈیا کی توسط سے میرے لکھنے کے دوران تک جاری ہیں۔اس حوالے بہت سے بلوچ لیڈران اور پارٹیوں نے خدشات کا اظہار کیا تھا کہ سوشل میڈیا پر اندرونی معاملات کو لانا نقصان کا باعث بن جاتا ہے جن میں قابلِ ذکر ڈاکٹر اللہ نظر تھے لیکن اب خیال کیا جارہا ہے کہ انکے یہ خدشات محض اسلئے تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان سے متعلق بہت سے منفی پہلو بلوچ عوام کے سامنے آشکار ہو جائیں کیونکہ سوشل میڈیا پر غداری سے نتھی کرنے والے ڈاکٹر اللہ نظر آج اس جدید دور کے تقاضوں کے آگے مجبور ہو کر خود بھی ٹوئٹر کا استعمال کررہے ہیں اور حال ہی میں انہوں نے اپنے ایک ٹوئٹ میں حیر بیار مری پر تنقید بھی کی تھی یعنی وہ سوشل میڈیا بھی استعمال کررہے ہیں اور اس پر تنقید بھی اسلئے انکے خدشات کو حقیقی نہیں بلکہ ذاتی مفاد سے نتھی کیا جارہا ہے، دوسری طرف جو بلوچ سیاسی کارکنان سوشل میڈیا پر تنقید کرتے آئیں ہیں انکا یہ موقف رہا ہے کہ بلوچ مسلح وغیر مسلح تنظیموں میں گروہیت اور انفرادیت حد درجہ سرایت کرچکی ہے اور اب انکے اس طرز فکر سے قومی تحریک تقسیم اور گروہیت کا شکار ہو کر نقصان کی جانب بڑھ رہا ہے بار ہا نشاندہی کے باوجود وہ اپنے ان منفی رجحانات کو روکنے پر راضی نہیں ہوئے اسلئے حقائق بلوچ عوام کے سامنے پیش کرکے انکے دباو اور رائے سے انہیں روکا جائے یا اگر کوئی قومی نقصان ہوتا ہے تو ذمہ داران آج سے ہی ظاہر ہوں۔دشمن کے بربریت کی وجہ سے نا بلوچ عوام سے اتنے وسیع پیمانے پر میل جول ہوسکتی ہے اور نا ہی جلسے و کارنر میٹنگ ہوسکتے ہیں اسلئے سب سے محفوظ، موثر اور فوری ذریعہ سوشل میڈیا ہے جس کے توسط سے عوام کو ان مسائل کے بابت آگاہی فراہم کی جاتی ہے اور آج وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں کیونکہ بلوچ سیاست سے دلچسپی لینے والا ہر بلوچ آج تمام حقائق سے آشنا ہے۔ جہاں اس سوشل میڈیا نے عرب بہار کی صورت میں ایک انقلاب لے آیا وہیں یہی سوشل میڈیا بلوچ سیاست کے اندر بھی ایک انقلاب لا رہی ہے، یقیناً روایتی ذہنیت کے حامل افراد اس ذریعے کو تسلیم کرنے میں ہچکچا رہے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے یا تو آپ ترقی کے ساتھ چلتے ہیں یا پھر ترقی آپ کو کچل کر آگے بڑھتا ہے۔

فلسطین لبریشن آرگنائزیشن

ترجمہ : آرچن بلوچ

___ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کو مئی 1964 اردن میں تشکیل دیا گیا پی ایل او کئی مختلف عرب تنظیموں پر مشتمل ایک گروپ تھا انہیں ایک چھتری اور ایک ہی بینر تلے جمع کیا گیا پی ایل او کے اس اکٹھ کا اصل مقصد یہ تھا انکا اپنا نقطہ نگاہ واگزار) کہ وہ ان تمام زمینوں کو اسرائیل سے واپس حاصل کریں جنہیں اقوام متحدہ نے دیا تھا، مشرق وسطہ کی موجودہ تاریخ پی ایل او کی اثرات سے مبرا نہیں ابتداء میں پی ایل او تشدد سے دور تھا مگر 1967 سے آگے اس میں شامل الفتح تنظیم جسکی معنی آزادی ہے، اس پہ غالب آگئی اور اس کا تعلق سورین باز و تھا اور اس کا سربراہی یاسر عرفات کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ 1967 اور 1973 میں جب اسرائیل فوجی فتحات کی زعم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فلسطینیوں کے زمینوں (سنائی اور جولان کے پہاڑی چھوٹیوں) کو واپس کرنے سے انکاری رہا تو اس تنظیم نے اپنی جہد میں انتہا پسندی کو ترجیح دی، بلکہ پی ایل او میں مزید اس سے بھی زیادہ انتہا پسند یونٹس ابھر کر سامنے آنے لگے۔ غالباً جن دو تنظیموں کا تعلق دہشت گردی سے جوڑا جاتا تھا وہ Black September سیاہ ستمبر اور Palestinian Front for the Liberation of Palestine تھے۔ ان دونوں گروپوں کا یہی خیال تھا کہ صرف تشدد کا راستہ ہی اسرائیل کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ عربوں کے زمینوں کو واپس کردے، ان کے اس متشددانہ کاروائیوں میں بم دھماکے، قتل اور ہائی جیکنگ جیسے انتہا پسندانہ طریقہ کار شامل تھیں۔ ان متشددانہ کاروائیوں میں سب سے بدنام زمانہ دہشتگردی کا وہ واقعہ تھا جو ان تنظیموں نے انجام دی وہ 1972 میں موینخ میں منعقدہ المپک کھیلوں میں شمولیت کرنے والے اسرائیلی اسکواڈ میں شامل کھلاڑیوں پر حملہ تھا جسے سیاہ ستمبر کے ممبروں نے انجام دی۔ اس حملے میں اسرائیل کے دو پہلوانوں کو فسلطینیوں نے عین موقع پر ہی قتل کردیا اور باقی نو کھلاڑیوں کو یرغمال بنا ڈالا، جرمن پولیس نے ان کھلاڑیوں کو اغواء کاروں کے چنگل سے بچھانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے اور اسرائیل کے یہ نو کھلاڑی بھی مارے گئے۔ اس کاروائی میں پانچ فلسطینی تشدد پسندوں کے علاوہ دو جرمن پولیس والے بھی اپنی جان کھو بیٹھے۔ باقی بچے آزادی پسند فلسطینی پکڑے گئے اور جیل میں ڈالے گئے۔ مگر بمشکل چھ ہفتے ہی گزرے تھے کہ پکڑے گئے یہ تمام فلسطینی تشدد پسند واپس لیبیا پہنچ گئے۔ ہوا یوں کہ اسی سیاہ ستمبر کے ممبروں نے جرمنی کے ایک ہوائی جہاز کو ہائی جیک کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ اگر ان کے ساتھیوں کو جرمن حکومت نے آزاد نہ کیا تو وہ طیارے میں سوار تمام مسافروں کو قتل کرڈالیں گے۔ فلسطینی اور عرب اقوام کے نظروں یہ لوگ ہیرو بن کر گھر لوٹے کیونکہ وہ فلسطین کی آزادی کیلئے اپنی زندگیاں نچاور کرنے کیلئے تیار تھے مگر دنیا میں بہت سے لوگوں کے نظروں میں یہ لوگ سنگ دل انسان تھے جنھیں انسانوں کو قتل کرنے میں کوئی رحم نہیں آئی، یہی وہ اپروچ تھا جس نے اسرائیل میں خودکش حملوں کی بنیاد ڈالی یعنی بیسویں صدی کی آخری سالوں میں اور اکیسویں صدی کی شروعاتی عرصوں میں! عرب دنیا میں اردن کی بادشاہ شاہ حسین نے اپنی اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے کوشش کی کہ پی ایل میں موجود تشدد پسند ممبروں میں اعتدال پسندی کو رواج دے، مگر اس کے الٹے نتائج نکلے اور اس کی وجہ سے خود مملکت اردن 1970 میں خانہ جنگی کا شکار ہوا، اور اس کی وجہ سے پی ایل او کے گوریلا یونٹس سوریا اور لبنان میں منتقل ہوئیں، یہاں انہیں ایسا لگا کہ یہاں کی آبادی انہیں زیادہ امداد دیگی، اور لبنان میں بہت سے لوگ یہی سمجھے کہ وہ آزادی پسند ہیں جولان کی پہاڑی چھوٹیوں کو بہت جلد اسرائیل کی قبضہ سے آزاد کرادیں گے، اور سوریا میں ان کو کھلی چھوٹ تھی۔ 1974 میں تمام عرب مما لک کے نمائندوں نے رباط میں یہ اعلان کیا کہ پی ایل او ساری فلسطینی قوم کی نمائندگی کا تمام ذمہ واری قومی اور بین الاقوامی سطح پر لے گا۔ 22 مارچ 1976 کو پی ایل او کے نمائندوں کو اقوام متحدہ میں داخلہ دیا گیا تا کہ وہ اسرائیل کے زیر تسلط اردن کی مغربی پٹی کے بارے تمام شرائط پر بحث کرسکے۔ ایسی مٹینگوں کی بدولت پی ایل او کو وہ مقام ملا جو وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ ان کو ملے۔ مگر پی ایل او میں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں یہ اعتراض تھا کہ یاسر عرفات اس کردار سے دور چلا جارہا ہے جس کردار سے اسرائیل کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ فلسطینیوں کے زمینوں کو واپس کردے۔ یعنی منوانے کیلئے طاقت کو استعمال کرنے کی حربہ! درحقیقت، یاسر عرفات چاہتا تھا کہ بیک وقت دونوں حربوں یعنی تشدد اور سیاسی محاذ کو بروکار لائے مگر پی ایل او میں موجود سخت گیر عناصر کو یہ خیال قبول نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1978 میں پی ایل او اندرونی خلفشار کا شکار رہوا۔ اس سے گو کہ یاسر عرفات کو پی ایل او کی نمائندہ رہنما کی قبولیت ملی مگر ایک چھوٹا گروہ جو بہت موثر کردار کا مالک تھا، اور کنٹرول سے باہر نکلی۔

☆☆☆☆☆☆☆

عالمی وعلاقائی سیاست اور ہم

__ حمل بلوچ

==========================

بین القوامی سیاست کے متعلق ایچ جے مارگن تھیو اپنی کتاب ؛سیاسیات بین القوام؛ میں لکھتا ہے کہ ،، بین القوامی سیاست محض قوت کے حصول کی جنگ ہے،، اسی طرح بین القوامی سیاست کے متعلق ایک اور مفکر جارج شوارزن برگر کہتا ہے کہ،، طاقت کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو خارجہ تعلقات میں اپنے مقاصد ومفادات کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جائے بلکہ طاقت کے تصور کی بدولت ملک کی ترقی وخوشحالی اور وقار کو ممکن بنانا چایئے ،لحاظہ ریاستوں کے آپس کے اچھے تعلقات اور گہرے معاملات میں ہمیشہ بین القوامی سیاست کا کردار دوصورتوں میں رہاہے کبھی مثبت کبھی منفی لیکن اکثر ریاستوں نے دونوں پہلووں سے فائدہ اٹھا کراپنے آپ کو سیاسی ،معاشی اور دفاعی پوزیشن میں استحکام بخشا ہے ۔اور آج بھی بین القوامی سیاست میں مثبت اور منفی دونوں پہلووں کو ریاستیں اپنے مفادات کے حصول کی خاطر بھر پور تیاریوں اور کوششوں کے ساتھ استعمال کرنے میں مصروف نظر آرہے ہیں، کچھ تو کامیاب دیکھائی دیتا ہے کچھ تو ناکامی سے دوچار ہے،اس بین القوامی سیاست سے کوئی بھی ریاست اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکتی، کیونکہ پوری دنیا اب ایک بڑے خاندان کی شکل اختیار کرچکی ہے اور ہر فرد قوم اور مملکتیں دوسرے فرد،قوم اور مملکتوں سے متاثر ہو رہے ہیں اور ہر کوئی فرد،قوم اور مملکت تنہا زندگی نہیں گزار سکتے اور ان کو (کچھ دو کچھ لو) کے اصول کے تحت زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے، ہر فرد،قوم اور مملکت ایک دوسرے کے وسائل پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور ہر کسی کے پاس مختلف قسم کے وسائل ہوتے ہیں جس سے دوسرا استفادہ کرتا ہے،مختلف ریاستوں کے وسائل بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں کسی کے پاس معدنی وسائل زیادہ ہوتے ہیں تو کسی کے پاس وافر مقدار میں پٹرول موجود ہوتا ہے، کسی کے پاس جدید ٹیکنالوجی ہوتا ہے،کوئی ملک زرعی اہمیت کے لحاظ سے آگے ہے اور کوئی صنعتی ترقی یافتہ ہے ہر کسی کا کسی بھی حوالے سے کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہے، جس کے زریعے ایک ملک دوسرے ملک سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی خاطر تعلقات بناتا ہے، جس میں عالمی وعلاقائی سیاست مختلف ہائے طریقوں سے ابھر کر اپنی حیثیت کو وسیع کردیتی ہے جس بین القوامی سیاسیات کے علم سے ہمیں ریاستوں اور قوموں کے باہمی رابطہ وبرتاو کے بنیادی اصولوں سے واقفیت حاصل ہوجاتی ہے، پھر ان سے قومیں اور ریاستیں اپنے مفادات کے حصول کے لئے سفارتی تعلقات کے دائرے کار کو عمل میں لاتے ہیں، جس سفارتکاری کی مدد سے اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کو عملی جامہ پہناتے ہیں، بین القوامی سیاست میں کوئی نہ کسی کا مستقل دوست ہوتا ہے اور نہ دشمن صرف مفادات عزیز ہوتے ہیں، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مفادات کے حصول کی جنگ نے دنیا کے ہر حصے میں جنگ کو جنم دے دیا ہے جس سے ہر خطہ متاثر ہورہا ہے، امریکہ افغانستان جنگ ،امریکہ عراق جنگ ،عراق وشام میں داعش کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا دوسرے ملکوں تک پھیل جانا، داعش کے خلاف نئی اتحاد بنا کے ساتھ کردوں کو ان کے خلاف کھڑا کر کے بھر پور مدد کرنا، ویسے کرد ایک آزاد ریاست کردستان بنانے کے لئے کئی عرصوں سے مسلح سرگرمیوں میں مصروف ہیں، افغانستان کے بعد یمن میں القاعدہ کی سرگرمیاں، پاکستان میں طالبان کی دہشتگردیاں، پاکستان کی بلوچستان پر قبضہ، بلوچوں کی پاکستان کے خلاف اپنے دفاع اور آزادی کے لئے مسلح کاروائیاں کی تیزی، ایران میں جیش العدل کی سرگرمیاں اور چین کی تیسری عظیم قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آنا دیگر ملکوں اور علاقوں میں شورش، ان عوامل نے بین القوامی سیاسی جغرافیائی ماحول کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، اس مفادات کی جنگ میں ہر کوئی اپنے مفادات کے لئے اپنی بساط کے مطابق کود پڑا ہے جس میں ہر کوئی دوسرے کا سہارہ لے کر اپنے مفادات کو تحفظ دینا چاہتا ہے، کیا اس سیاسی جغرافیائی ماحول کی تبدیلیاں محکوم قوموں کی آزادی کی راہیں ہموار کرسکتی ہیں؟ جس طرح ہم دیکھ رہے ہیں پچھلے کئی برسوں سے کرد ایک آزاد کردستان کے لئے لڑ رہے تھے تو کسی نے ان کا کوئی سپورٹ نہیں کیا جب ہم نے دیکھا عالمی سیاسی ماحول تیزی کے ساتھ تبدیل ہوگیا، دنیا کی مفادات کا آپس میں ٹکراو شروع ہوگیا تو انہوں نے کردوں کو اسلحہ سے لیس کر کے ان عوامل کے خلاف لڑوانا شروع کردیا، اب یہ کردوں پر انحصار کرتا ہے کہ وہ بین القوامی سیاسی ماحول کو کس طرح اپنے حق میں استعمال کر کے ایک آزاد کردستان بنانے کی طرف بڑھ سکتے ہیں، لیکن یہ ہمارے لئے بھی ایک اہم سوال ہے کہ اس بڑھتی ہوئی بین القوامی سیاسی تبدیلیاں اور مفادات کی تبدیلیوں کا بلوچستان کے سیاسی منظر نامے اور مسلح کاروائیوں پر اثرات کو ہم کس طرح اپنے مفادات میں استعمال کرسکتے ہیں، اس کے لئے ہمیں بین القوامی سیاست کا گہرائی سے مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے، اس کو ہم اس وقت اپنے مفادات میں لاسکتے ہیں جب ہم دنیا کو متفقہ واضح ایجنڈا اور مقاصد کے ساتھ اپنے خارجہ پالیسی کے متعلق آگاہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں، اور اپنی سفارتکاری کی سرگرمیوں کو

تیز کر کے ان سے مضبوط تعلقات استوار کریں، اس طرح نہیں کے کوئی کہے کہ میں سوشلزم نظام کو بلوچستان میں لانا چاہتا ہوں، کوئی کہے میں جدید طرز جمہوریت کا نظام لانا چاہتا
ہوں، پھر ایسے نہ کوئی ہماری سنے گی اور نہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوگی، اس عالمی سیاسی منظر نامے اور عالمی مفادات کی نئی تبدیلیوں کو دیکھ کر بلوچ قومی مفادات کے تحفظ کے لئے
سنگت حیر بیار اور ان کے دوستوں نے کافی غور وتحقیق کے بعد اپنے مخلصانہ کوششوں سے بلوچستان کے نظام کا ڈرافٹ ترتیب دے کر بلوچ عوام، مسلح تنظیموں اور سیاسی تنظیموں اور
پارٹیوں کو دے کر کہا کہ اس کی گہرائی سے مطالعہ کر کے ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کر کے اور بہتر نقاط شامل کریں تاکہ ڈرافٹ بلوچستان کے بہتر نظام کے لئے بہتر سود مند
ثابت ہوسکے، لیکن بدقسمتی سے بی ایل ایف، بی آر اے ان کے ذیلی سیاسی پارٹیوں اور تنظیم بی این ایم اور بی آر پی نے قومی مفادات کے حصول کو آسان کرنے کے بجائے وہی
پرانے روش کو برقرار رکھ کر قومی مقصد سے زیادہ گروہی، شخصی اور پارٹی مفادات کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر اللہ نظر نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہر کسی کا اپنا اپنا پارٹی، تنظیم اور چارٹر ہے۔ ڈاکٹر اللہ
نظر کی اس بات سے یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ قومی مشترکہ مفادات سے زیادہ تنظیمی اور پارٹی مفادات کو عزیز تر سمجھتا ہے، کبھی ڈر لگتا ہے کہ ڈاکٹر اللہ نظر کی یہ والی سوچ مضبوط ہو کر کل کوئی
ایسا نہ کہے کہ ہر کسی کا اپنا اپنا علاقہ ہے اس علاقے کے کنٹرول سنبھالنے کا حق صرف اسی کو ہے جو اس علاقے سے تعلق اور مضبوط طاقت رکھتا ہے۔ اب ایسا لگ رہا ہے کہ ہم دنیا کے
کسی سیاسی وجغرافیائی حالت کی تبدیلی سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں رہے ہیں جس سے ہماری تحریک کو فائدہ پہنچے، جس طرح نواب خیر بخش مری کہتے تھے کہ 1971 میں پاکستان اور
بنگلہ دیش کی سیاسی وجغرافیائی تبدیلی سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا بہت غلطی کی تھی، آج پھر ہم وہی غلطی کو دہرا رہے ہیں، جس طرح پاکستان اور بھارت کا کشمیر، ورکنگ باؤنڈری اور
کنٹرول لائن پر تنازعات چل رہے ہیں، ایک دوسرے کے آبادیوں پر گولے برسائے جارہے ہیں اور ایسے موقع پر بھارتی سیاسی رہنما خود کہتے ہیں کہ جس طرح پاکستان کشمیریوں
کی مدد کر کے ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے پھر تو ہمیں بلوچوں سے بھی بات اور انکی مدد کرنی ہوگی کیونکہ بلوچستان آزاد ملک تھا پاکستان نے قبضہ کیا ہے۔ گو کہ ان کا اپنا نکتہ نظر یہ
ہوتا ہے کہ پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے لئے ایسے بیان دیتے ہیں تاکہ پاکستان کشمیری مجاہدوں کو ہمارے خلاف استعمال نہ کرے، لیکن اس بیان پر یقیناً ہمارے مفادات ہیں اگر
ہم کو ان کی اچھی سفارتکاری جانیں، چونکہ بھارت اور پاکستان کی وجود سے پہلے اختلافات اور عداوتیں تھی اور وجود سے لیکر 1965 کی جنگ 1971 کی جنگ میں بنگلہ دیش کی
مدد کرنا، کارگل اور سیاچن کی لڑائی، پاکستان کا اپنے لے پالک مجاہدوں سے بھارت کی بمبئی ہوٹل پر حملہ کروانا اور کبھی بھارت کا پاکستان میں پانی کا دریا چھوڑنا جو پاکستان میں
سیلاب کا سبب بنتا ہے، کبھی بھارت کا پانی کے دریاؤں کو بند کرنا جو پاکستان میں معاشی تباہی کا سبب بنتا ہے اب سرحدی معاملات پر ایک دوسرے کو دھمکی دینا دونوں کی فوجیوں کا
ایک دوسرے کے خلاف چوکس ہونا اور گولے برسانا۔ یہ ایسے معاملات ہیں جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں اگر ہم میں خلوص دل اور نیک نیتی شامل ہو۔ اس مفادات کے حصول کی
جنگ میں جب بھارت پاکستان کے خلاف بنگلہ دیش کی مدد کر سکتا ہے، اگر ہم میں بہتر سفارتکاری ہو تو بھارت بھی پاکستان کے خلاف ہماری مدد کی طرف متوجہ ہوسکتی ہے، وہ مدد کسی
بھی شکل میں ہوسکتی ہیں مثلاً سیاسی وسفارتکاری، معاشی تعاون اور اخلاقی حمایت وغیرہ وغیرہ، شائد خفیہ طور پر جنگی ساز وسامان فراہم کرے، لیکن ان تمام کا انحصار صرف اور صرف
اچھے وبہتر تعلقات پر منحصر ہے، آج ہمیں اپنے تحریک کو بین القوامی سطح پر متعارف کرانے کے لئے اور مظبوط بنانے کے لئے بین القوامی سطح پر ڈپلومیسی کے ذریعے سے ان ممالک
کی سیاسی واخلاقی اور معاشی مدد وحمایت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ شائد آج اس سفارتکاری اور ڈپلومیسی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے حیر بیار اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بیرون
ملک چلے گئے جہاں انہوں نے بلوچ قومی جہد کے حق میں بہتر ڈپلومیسی کا مظاہرہ کیا جو کم وقت میں دنیا ہماری طرف متوجہ ہو کر ہماری تحریک کے حق میں اپنا نکتہ نظر پیش کرنے لگا
جس سے ہماری قومی جہد کو فائدہ پہنچا ہے۔ کبھی بلوچستان میں پاکستانی ظلم وزیادتی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق پاکستان کو اس گھناونے عمل سے باز رکھنے کو کہا
جاتا ہے، کبھی اقوام متحدہ کی وفد کا بلوچوں کی آواز کو سننے کے لئے بلوچستان کا دورہ کرنا، کبھی بلوچستان کی آزادی کے حق میں امریکی کانگریس میں قرارداد پیش کرنا، گو کہ امریکی
کانگریس میں قرارداد پیش کرنے کا ایک مقصد پاکستان پر ایک دباو ہوسکتا ہے، لیکن اس میں ہماری مسلح کاروائیاں اور بین القوامی سفارتکاری کا بڑا ہاتھ ہے، جس مفادات کے
تصادم سے امریکہ کو بھی ہماری ضرورت پڑگئی ہے، اور دیگر ممالک کو بھی ہماری ضرورت پڑ گیا ہے، اب اس کے لئے ہمیں آچھی سفارتکاری اور ڈپلومیسی کے ضرورت ہے، اس خلا کو
پر کرنے کے لئے حیر بیار اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بیرون ملک بیٹھ کر اچھے سفارتکاری کر رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر اللہ نظر کو اس خلا کی کمی کا کوئی احساس نہیں وہ ان مخلص
دوستوں پر بے بنیاد الزامات لگا کر تحریک کے خلاف ایک منفی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ پاکستان میں دہشتگردی کے بڑے واقعات کا رونما ہونا اور دہشتگردوں کا نسل افزائش کا پاکستا
ن سے پیدا ہونا، دنیا میں دہشتگردی کے لئے پاکستان کا دہشتگردوں کی سپلائی کرنا، بین القوامی امن وسلامتی کے لئے خطرے کی گھنٹی بجانا، خاص خاص طور پر افغان امریکہ جنگ
میں دہشتگردوں کی پشت پناہی کرنا پھر امریکہ کی طرف سے پاکستان پر مسلسل ڈرون حملے کرنا اور نیٹو افواج کی پاکستانی سرحدات پر بمباری کرنا، یہ ایسے معاملات ہیں اگر ہم کو بین
القوامی سیاسی اصولوں کا اچھی طرح سے ادراک وفہم اور سیاسی اداکاری ہو تو ہم بین القوامی سیاسی موقف اور رائے کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں ویسے امریکہ دہشتگردی کے
خاتمے کے لئے افغانستان میں پاکستان کی دوہری موقف کی وجہ سے مشکلات کے شکار میں دوچار ہے، اس اہم معاملے پر جہاں افغانستان اور بلوچستان کے سرحدات ایک
دوسرے سے ملتے ہیں اگر یہاں ہم امریکہ سے ڈپلومیسی اور سیاسی اداکاری کیلئے کامیاب ہوگئے تو پھر ہماری تحریک کی مضبوطی اور کامیابی کا اندازہ شائد ممکن نہیں لیکن بدقسمتی سے

ایسے اہم معاملے پر ہم نے ابھی تک کچھ حاصل نہیں کیا ہے جس سے ہمارے تحریک کو فائدہ پہنچے کیونکہ ہم ابھی تک بین القوامی سیاست کے اصولوں کو سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔ اس خطے میں چین کا ایک اہم قوت کے ساتھ ابھرنا یقیناً امریکی مفادات کے تصادم کا باعث بن جاتا ہے اور پاکستان کا امریکی وفاداری سے زیادہ چین کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ کرنا، اس مفادات کے تصادم سے فائدہ اٹھانے کے لئے امریکہ کا پہلے سے اپنی بحری بیڑوں کا جنوبی اشیا کے جزیروں پرا تارنا اور امریکہ کا سوائے بھارت کو اپنے ساتھ شامل کر نے میں دوسرا کوئی ملک کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں اب کوئی خاص کامیابی نظر نہیں آرہا ہے، قطع نظر ایشیائی دوسرے ملکوں کے امریکہ کی چھوٹی پیانے تک حمایت کا مظاہرہ کرنا، اب اس لئے امریکی مفادات کی تحفظ کے لئے یہ بات لازمی امر بن گیا ہے کہ وہ بلوچستان کی مدد کرے تا کہ اس بدلتی ہوئی صورتحال سے اپنے مفادات کے دفاع کرنے میں کامیاب ہوسکے، چنانچہ ان مفادات میں بلوچستان کے بھی اپنے مفادات ہیں اور امریکہ کے بھی اپنے مفادات ہیں، دونوں ایک دوسرے کی مدد وتعاون سے اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ اگر ان مفادات کی جنگ میں بلوچ امریکہ کی حمایت میں اس موجودہ سیاسی حالات کے تناظر میں چلا جاتا ہے تو وہ اپنے مفادات کو بہتر انداز میں تحفظ دے کر حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ چین تو پہلے سے یہ بات کا کھلم کھلا اظہار کر رہا ہے کہ پاکستان میں علیحد گی پسند تنظیموں کے خلاف کاروائی اور مدد کرنے میں پاکستان کا بھرپور ساتھ دینگے، اب اس موجودہ سیاسی ماحول میں ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے کہ چین بلوچوں کی آزادی کی تحریک کی مدد وحمایت کرے، اگر کل بین القوامی مفادات نے نئے رُخ کا موڑ لیا بلوچوں کے مفادات امریکہ کے بجائے چین کے ساتھ چلے گئے تو پھر بلوچ بھی عالمی مفادات کے کھیل میں اپنے مفادات کے بہتر تحفظ کے لئے چین کے حمایت میں بھی جاسکتا ہے، کیونکہ بین القوامی سیاست میں مفادات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ہر کوئی اپنے مفادات کے تحفظ میں اپنی اپنی حکمت عملی بھی تبدیل کرتا رہتا ہے، جہاں وہ اپنے مفادات کے تحفظ کو بہتر سمجھتا ہے وہاں چلا جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے بلوچ آزادی کے تحریک کے حق میں وقتاً فوقتاً اپنے موقف کا اظہار کیا ہے، یا وہ امریکی کانگریس میں قرارداد کی شکل میں ہوں یا دیگر سینٹروں کا بلوچوں کے ساتھ بیٹھ کر اس عزم کا اظہار کرنا کہ ہم آپ بلوچوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ڈانار ہرا بیکر کے بعد اب لوئس گومرٹ بھی بلوچوں کی آزادی کے حق میں میدان میں اتر آیا ہے جس نے کانگریس میں ایک تقریر بھی بلوچوں کے حق میں کیا ہے، بین القوامی مفادات کی جنگ اور عالمی سیاست کسی بھی وقت کسی بھی رخ اختیار کر

عالمی مفادات کی نئی تبدیلیوں کو دیکھ کر بلوچ قومی مفادات کے تحفظ کے لئے سنگت حیربیار اور ان کے دوستوں نے کافی غور وتحقیق کے بعد اپنے مخلصانہ کوششوں سے بلوچستان کے نظام کا ڈرافٹ ترتیب دے کر بلوچ عوام، مسلح تنظیموں اور سیاسی تنظیموں، پارٹیوں کو دے کر کہا کہ اس کی گہرائی سے مطالعہ کر کے ان کی خامیوں وکمزوریوں کو دور کر کے اور بہتر نقاط شامل کریں تا کہ ڈرافٹ بلوچستان کے بہتر نظام کے لئے بہتر سودمند ثابت ہوسکے، لیکن بدقسمتی سے بی ایل ایف، بی آر اے ان کے ذیلی پارٹیوں اور تنظیم بی این ایم اور بی آر پی نے قومی مفادات کے حصول کو آسان کرنے کے بجائے وہی پرانے روش کو برقرار رکھ کر قومی مقصد سے زیادہ گروہی، شخصی اور پارٹی مفادات کو ترجیح دی

سکتے ہیں پھر اس وقت بلوچوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمیں اپنے مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اداکاری کا رُخ کس طرف موڑنا ہے لیکن ابھی حالات کی نزاکت وتبدیلی، عالمی مفادات کی جنگ اور سیاست سے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان حمایتی ملکوں سے زیادہ ہم پاکستان مخالف ملکوں سے اپنے مفادات کی بہتری کے لئے اچھی حمایت اور مدد حاصل کر سکتے ہیں، اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ترقی پذیر اور تیسری دنیا کے ممالک کی معاشی حالت پر گہری نظر رکھی ہوئی ہیں اور ان ممالک کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے مختلف حیلوں اور بہانوں کے زریعے سے ان کو اپنے زیر اثر لانے کی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں تا کہ اپنا اپنا حلقہ احباب وسیع کرنے میں کامیاب ہوسکیں لحاظہ ایسی صورتحال میں ہر ملک اپنے اپنے مفادات کو دیکھ کر اپنی پالیسیاں مرتب کرتا ہے، اس عالمی وعلاقائی بڑھتی ہوئی سیاسی صورتحال کی اتار چڑھاؤ اور بلوچ تحریک آزادی نے پاکستان کے لئے بہت سے مشکلات پیدا کئے ہیں، کیونکہ پاکستان کا بلوچستان کے بغیر قائم ہونا بہت پیچیدہ مسئلہ ہے، (قطع نظر بلوچستان کی آزادی کی تحریک کا پاکستان کے اپنے علاقوں میں اثرات اور ان کی علیحد گی کی تحریک کو ابھارنا اور تقویت پہنچانا) پاکستان بلوچوں کی آزادی کی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے، لیکن اب تک پاکستان تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے کے باوجود ناکام نظر آرہا ہے، بدقسمتی سے ہم بھی پاکستان کی ناکامی کی طرح خود کو منظّم اور مظبوط کرنے میں بھی ناکام ہوئے ہیں، اور ہماری اس ناکامی اور کمزوری سے پاکستان بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس ناکامی کو کامیاب بنانے کے لئے بی ایل اے کے دوست بی ایل ایف سے بہت رابطے میں رہے ہیں اور یہاں تک وہ بی ایل ایف کے کیمپ میں جا کر مہینوں تک بیٹھے رہے اور بہت دفعہ بی ایل ایف کو صلاح ومشورے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ فیصلہ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے، اور یہاں تک

دوست تیار ہوئے ہیں کہ اگر آپ بی ایل اے کا نام بدل کر کوئی اور نام رکھنا چاہیں بھی راضی ہیں مگر قومی مسائل کے حل میں بہتر اقدامات اٹھائیں، جس سے پوری قوم کے مفادات شامل ہوں، لیکن بدقسمتی سے بی ایل ایف کے دوستوں نے ربط و آمد کے سنہری موقع کو گنوا کر کافی سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا جو تحریک پر چند سالوں کے دوران بہت نقصانات کے باعث کا سبب بنے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ بی ایل ایف اپنے گروہی، شخصی و لیڈری مفادات کی خاطر بی ایل اے کے دوستوں پر کیا کیا الزامات نہیں لگایا جا رہا ہے، جس سے غیر انقلابی قوتیں بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، اگر اس ناکامی پر قابو پانے کے لئے بی ایل ایف، بی آر اے، بی این ایم، بی آر پی اور بی ایس او نے سنجیدگی، نیک نیتی مخلصی و ایمانداری اور انقلابی اصولوں کے معیار کے مطابق ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا تو پھر وہ دن دور نہیں ہوگا جب پاکستان 1935 کے زلزلہ کی طرح ہم کو زمین بوس کر دے گا۔

جس طرح ہم دیکھ رہے ہیں آج پاکستان بڑی عجلت کے ساتھ بلوچ قومی آزادی کی جنگ کو مذہبی شدت پسندی اور فرقہ وارانہ جنگ میں بدلنے کے لئے کیا کیا حربہ استعمال نہیں کر رہا ہے، کبھی ہزارہ برادری کی ٹارگٹ کلنگ کرنا، کبھی طالبان کے نام پر کوئٹہ شہر میں دھماکے کرنا، کبھی ذکری نمازی فسادات پیدا کرنا، داعش کے لئے بلوچستان کے دیواروں پر چاکنگ کرنا، اب شاہد اللہ شاہد اور ان کے کچھ کمانڈروں اور ساتھیوں کو داعش میں بھیجنا تاکہ دنیا اس طرف متوجہ ہو جائے کہ یہاں بھی داعش سرگرم ہو رہی ہے پھر ساتھ میں یہ بہانہ کرنا کہ اب بلوچستان میں بھی داعش کی جڑیں مظبوط ہو رہی ہیں تاکہ دنیا سے اچھی مدد اور طاقت مل جائے جو بلوچ تحریک کے خلاف استعمال ہو سکے، دوسری جانب دنیا کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بلوچستان میں کوئی قومی آزادی کی جنگ نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہاں مذہبی شدت پسندی اور فرقہ وارانہ جنگ ہو رہی ہے جس کا ایک اور تازہ مثال کوئٹہ شہر میں مولانا فضل الرحمٰن پر خود آئی ایس آئی نے خودکش حملہ کروایا، اب ماشکیل اور مکران میں جیش العدل کو منظم کر کے مغربی بلوچستان پر شیعہ اور ایرانی گجروں پر حملہ کروا رہا ہے، پاکستان اسی کوشش میں ہے کہ جیش العدل منظم اور مظبوط ہو کر کل اس کو بھی بلوچ آزادی پسند جنگجوؤں کے خلاف استعمال کرنے میں کامیابی ملے، جس طرح آج ہم دیکھ رہے جیش العدل والے ان علاقوں میں ایف سی کیمپ میں جاتے نکلتے ہیں، پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی اب تک ان کے آگے رکاوٹ نہیں بنا ہے، جس طرح آج ملاعمر کی شکل میں ملاعمر کو بلوچ تحریک کے خلاف استعمال کر رہا ہے، اور کئی بلوچوں کو طالبان کے ذریعے سے وزیرستان اور افغانستان میں تربیت دے رہا ہے تاکہ یہ مجاہد بن کر کل ان کو بھی کسی نہ کسی طرح سے بلوچ آزادی پسند جنگجوؤں کے خلاف استعمال کرنے میں کوئی نہ کوئی کامیابی مل جائے۔ بلوچستان کے جن جن علاقوں میں جہاں جہاں بلوچ تحریک منظم اور مظبوط ہو رہی ہے اور بلوچ حریت پسند جنگجوز یادہ سرگرم ہیں، وہاں پاکستان طالبان ودیگر اسلامی اور مذہبی شدت پسند اور جہادیوں کی موجودگی کا تاثر دے کر بین الاقوامی طاقتوں کے ذریعے سے ان علاقوں پر حملہ کروانا چاہتا ہے، تاکہ بلوچ حریت پسند جنگجوؤں کو نقصان پہنچے، اگر پاکستان بین الاقوامی موقف کو اس تاثر کے ذریعے سے بھی اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوتا ہے پھر ان علاقوں میں اسلامی شدت پسند تنظیموں کو بھیج کر یا خود وہاں اسلامی شدت پسندوں کے نام سے نئے خود ساختہ تنظیم بنا کر ان کے زریعے سے حالات کو اس نہج پر پہنچاتا ہے کہ دنیا یقین کر لے کہ حقیقتاً یہاں اسلامی شدت پسند تنظیمیں اپنا گڑھ مضبوط کر رہے ہیں، جس طرح آئی ایس آئی نے اب مکران میں خود ساختہ الفرقان نامی تنظیم بنا کر اس کے زریعے سے لڑکیوں کی پڑھائی پر پابندی لگائی ہے اسکول پرنسپل اور اسٹاف کی بھی گاڑیوں کو جلائی گئیں ہیں، جس طرح وزیرستان میں بچیوں کے اسکولوں کو دھماکوں سے اڑایا گیا، جلایا بھی گیا پھر دنیا مزید اسلامی شدت پسندوں کے خاتمے کی طرف متوجہ ہوئی اور پاکستان کی اچھی مدد اور کمک بھی کئی گئی جن مدد و کمک کو پاکستان نے اپنے مخصوص مفادات کیلئے استعمال کیا، اب دنیا کی مدد و تعاون کو حاصل کرنے کے لئے وزیرستان والے فارمولے کو آئی ایس آئی بلوچستان میں استعمال کر رہا ہے، بچیوں کی اسکولوں کو جلایا جا رہا ہے عنقریب دھماکوں سے بھی اڑایا جائے، تاکہ دنیا متوجہ ہو کر اچھی مدد و تعاون کرے یا بین الاقوامی قوتوں کے زریعے سے خود ان علاقوں پر حملے کرے، اور دوسری طرف بلوچ قومی آزادی کی جنگ کا تاثر ختم ہو کر مذہبی شدت پسندی کے نظریے کا تاثر جنم لے کر فروغ پائے تاکہ ہر کوئی یہ کہے کہ یہاں قومی آزادی کی جنگ نہیں ہو رہی ہے بلکہ مذہبی شدت پسندی ہو رہی ہے، پاکستان بین الاقوامی کاروائیاں کے دوران مذہبی شدت پسندوں کو وہاں سے نکال کر دوسرے علاقوں میں منتقل کرتا ہے جبکہ اپنے کاروائیوں کے دوران میں ان شدت پسندوں کو اپنے ساتھ ملا کر بلوچوں کے خلاف بھرپور استعمال کرتا ہے، ان کے پیچھے کارفرما تمام عوامل کا مقصد بلوچ قومی تحریک کا کاونٹر اور خاتمہ کرنا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم ایسے حالات سے مقابلہ کرنے اور ان سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو کس حد تک تیار کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، کیونکہ اگر ہم نے بین الاقوامی آراء اور ترجیہات کو پاکستان کے خلاف اور اپنے حق میں استعمال کرنا شروع نہیں کریں تو ایسے نازک حالات میں پاکستان ہمیں بہت نقصانات پہنچا سکتا ہے۔

جس طرح آج بین اقوامی و علاقائی سیاست میں نمایاں تبدیلیاں آئیں ہیں تو پھر ہم کو ایسی تبدیلیوں سے بھی فائدہ اٹھا کر اپنی تحریک کو منظم اور طاقت بخشنا ہے۔ اس کے لئے ہمیں بین اقوامی مفادات کے کھیل کی جنگ، سیاسی اداکاری اور خاص طور پر بین لقوامی سیاست کی گہری دلچسپی سے مطالعہ اور ان کے معیار اور پیمانے کو سمجھنا چاہئے پھر اپنی سفارتکاری اور ڈپلومیسی کو خلوص دل، نیک نیتی اور ایمانداری سے بین اقوامی سیاسی اصولوں کے معیار کے عین مطابق تیز کرنا ہے تاکہ پوری دنیا سے ہمارا رابطہ بحال ہو سکے پھر ان کو اپنے حق میں سیاسی و اخلاقی حمایت کروانے میں مجبور کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ جس میں ہماری تحریک کی کامیابی اور آزادی کے منزل کا راز پوشیدہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بلوچ طلبا سیاست کے داؤ پیچ نود بندگ بلوچ کے قلم سے

بی ایس او کے افکار و کردار

ہماری اگر سیاسی نفسیات سمجھنا ہو تو نہ ماؤ، مارکس، پاولو اور فینن کی ضخیم کتابیں ٹٹولنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی سیاسیات و نفسیات پر عبور حاصل کرنا شرط ہے بلکہ ہمارے مختصر سیاسی تاریخ کے روزمرہ کو ایک بار غور سے پڑھیں سب سمجھ آجائے گا، ہم وہ قوم ہیں جب عطاء اللہ مینگل کوئٹہ میں چنگھاڑ کر کہتا ہے کہ ''نوجوانوں پہاڑ تمہیں پکار رہے ہیں'' تو ہم گلا پھاڑ کر نعرے لگاتے ہیں پھر مڑ کر نہیں دیکھتے کہ عطاء اللہ خود کہاں گیا، ہم وہ قوم ہیں جہاں اختر مینگل کہتا ہے کہ ''اگر ڈیرہ بگٹی میں ایک گولی چلے گی تو جھالاوان میں پانچ'' ہم زور سے تالیاں بجاتے ہیں لیکن جھک کر اختر مینگل کے بندوقوں کے زنگ کو نہیں دیکھتے، ہم وہ قوم ہیں جہاں لیڈر کہتا ہے کہ ''آزادی اب افغانستان تک پہنچ چکی ہے اور بہت جلد بلوچستان میں داخل ہوگا'' ہم اس امید میں بجلی کے بل تک جمع نہیں کرتے پھر سالوں گذرنے کے باوجود کسی کا گریبان پکڑ کر پوچھتے تک نہیں کہ بجلی تو کاٹ دی گئی لیکن یہ آزادی ابتک پہنچا کیوں نہیں، ہم وہ قوم ہیں جہاں کا طلباء رہنما بارہ بجے نیند سے اٹھ کر آنکھوں میں نشے کا خمار لیئے تپتی دھوپ میں ہمیں روڈ پر بٹھا کر سرخ آنکھوں کے ساتھ گرجتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ہم خون اور پسینہ دیکر اس ریاست کو نیست و نابود کر کے اپنی آزادی چھین لیں گے'' پھر جلسے کے بعد ہاسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر پبلک سروس کمیشن کی تیاری کرنے لگتا ہے اور ہم اسے وقت کا چی گویرا قرار دیکر چندہ کر کے اسکے پوسٹر بنوا کر اس پر انقلابی رہنما لکھتے ہیں لیکن شعلہ بیانی کے پیچھے چھپے ان تضادات پر ایک سوال تک نہیں کرتے، ہم وہ قوم ہیں جہاں ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ توہین آمیز خاکے جاری کرنے والے میگزین چارلی ہیبڈو کے ''آزادی اظہارِ توہین'' کے حق میں ٹویٹ کر کے اس پر حملوں کی مذمت کرتا ہے لیکن خود پر تنقید کرنے والے سلام صابر کے سر کو عمران فاروق کی طرح اینٹوں سے کچلنے کا اسکا دل کرتا ہے اور ہم اسے ایک آزاد جمہوری معاشرے کیلئے رہنما سمجھتے ہیں۔ تضادات کے ان گھاٹیوں سے پانی پینے کے بعد اب ہم دعوؤں اور حقائق کے بیچ پہچان مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں، ہم سر اونچا کیئے تاروں کو گن رہے ہیں لیکن رستے کا گھڑا تک ہمیں دِکھتا نہیں۔ ہم ان دعوؤں میں اب اتنے کھو چکے ہیں کے اب جھوٹے داعیوں کو بھی اپنے ہی من گھڑت دعووں پر یقین ہو چلا ہے اور خوبصورت منظر کشیوں کے ایک ایسے دنیا میں کھو گئے ہیں کہ دیو مالائی کردار نارسس کی طرح پانی میں اپنا چہرہ تکتے جا رہے ہیں اور خود پر ہی فریفتہ ہوئے جا رہے ہیں پیاس کے باوجود پانی کے سطح کو اسلیئے نہیں چھوتے کہ کہیں وہ عکس ٹوٹ نہ جائے۔ میرے سامنے بکھرے صفحات پر بی این ایم کے کونسل سیشن کے پہلے دن کا بیان، بی ایس او کے سینٹرل کمیٹی کے اجلاس کا بیان اور بہن کریمہ کا ایک آرٹیکل پڑا ہوا ہے، میں تضاد در تضاد کی اس چلتی بھٹی سے صرف دو جملے آپکے سامنے رکھتا ہوں، بہن کریمہ کہتی ہیں کہ ''بی ایس او آزاد وہ واحد ادارہ ہے جس نے ہمیشہ سیاسی اداروں اور جمہوری رویوں کو پروان چڑھا کر معاشرے میں ایک ایسی تبدیلی کی بنیاد ڈالنے میں کردار ادا کیا جہاں پر ایک جامع بحث کا آغاز ہوا'' اور چیئرمین خلیل کہتا ہے ''بلوچستان کے طول و عرض میں بلوچ نیشنل موؤمنٹ ایک معتبر پارٹی کے نام سے نہ صرف جانا جاتا ہے بلکہ عوامی اور خصوصاً بلوچ نوجوانوں اور خواتین کی بھرپور شمولیت اور فعال کردار پارٹی پروگرام کو ہر سطح پر پہنچانے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں'' ذرا زمینی حالات و حقائق سے چشم پوشی کر کے ان جملوں کو پڑھیں تو انکی حرارت دل و دماغ میں بلا کی سی گرمی پیدا کر دے گی لیکن حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں تو ان دعوؤں کا تعلق کم از کم بلوچ و بلوچستان سے ہمیں نہیں ملے گا شاید مریخ پر ایسے حالات ہوں، بحث کے آغاز کا داعی کریمہ بلوچ اظہار اختلاف پر تنظیم کو دولخت کروا بیٹھی اور بلوچستان کے طول و عرض میں بی این ایم کو دیکھنے والا خلیل بی این ایم کی نیم مردہ جسم کو مکران کے چند خشک ندیوں میں گھسیٹ رہا ہے۔ بلوچستان کے حالات دیکھیں اور ان حالات میں ان تنظیموں کی بے کیفی و بے وقعتی دیکھیں اور پھر ہر بیان و ہر تقریر کی متن کو ان پر پرکھ کر پڑھیں آپ کو حقائق و دعوؤں میں ایک بہت بڑا خلیج آسانی سے دِکھے گا، اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ یہ ہمارے سیاسی کلچر و سیاسی نفسیات کا وہ حصہ ہے جو ماضی سے مستعار لیئے ہم آگے جا رہے ہیں، سیاست حقائق کے بنیاد پر نہیں بلکہ مفروضات و دعوؤں کے بنیاد پر کرو، ان دعوؤں پر خود بھی یقین کرو اور دوسروں کو بھی ہمیشہ یقین دلاتے رہو،" باتیں

کروڑوں کی دکان پکوڑوں کی" کے مصداق اپنے اپنے سیاسی دکان اور دکانداری کی قیمت بڑھاتے جاؤ، اور یہ طریقہ ہمیشہ سے کامیاب بھی رہا ہے کیونکہ غیر حقیقی کے سامنے کوئی حقیقی چیز سامنے نہیں آئی ہے کہ تمیز ممکن ہو، بدتر کا سامنا کبھی بہتر سے ہوا ہی نہیں، جھوٹ کے میراتھن میں کبھی سچ دوڑا ہی نہیں ہے اسی لیئے جتنا کرارا جھوٹ اتنا زیادہ کامیاب۔ لیکن میں ماضی کو مسترد کر کے صرف حال پر اکتفاء کر کے تجزیہ کروں تو حیرت و پریشانی ہوتی ہے کہ جھوٹ اور مفروضات کے بدولت ہم ایک آفاقی اور قطعی سچائی سماجی آزادی تک آخر کیسے پہنچیں گے۔ بی ایس او کے قائم مقام متنازعہ چیئرمین بانک کریمہ کے حالیہ ایک مضمون اور ایک بیان کو پڑھنے کے بعد موقع محل جان کر میں اپنا موضوع بحث محض بی ایس او تک ہی محدود کرتا ہوں۔ سماج میں سیاسی تحریک کسی بھی سطح کا ہو، ایک مقامی زمیندار ایکشن کمیٹی ہی کیوں نہ ہو میں اسے صحت مند عمل سمجھتا ہوں بی ایس او کے قریباً پانچ دہائیوں پر محیط تاریخ کے نشیب و فراز سے قطع نظر میں اس امر سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا کہ بلوچ سیاست کے کسی بھی بحث میں بی ایس او قابلِ ذکر ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی ضروری ہے کہ حقائق کے صراحی کو انڈیل کر تہہ تک جھانک کر دیکھیں کہ آیا وہ دعوؤں سے میل کھاتے بھی ہیں کہ نہیں۔ اپنے دورِ بلوغت سے لیکر آج تک بی ایس او کے یہ دعوے سنتا آرہا ہوں کہ، بی ایس او تحریک کا ہراول دستہ ہے، بلوچ سیاست کی ریڑھ کی ہڈی ہے، واحد انقلابی ریڈیکل تنظیم ہے، انقلابی سیاست کا معمار ہے، قائد ہے، نمائندہ ہے، بانی ہے اور پتہ نہیں کیا سے کیا ہے، لیکن اب ذرا حقائق کی طرف جائیں تو یہ بات اب بلا بحث طے شدہ ہے کہ بلوچ مقصد قومی آزادی ہے اور یہی سیاست کا محور ہونا چاہئے پھر اسکا مطلب یہ ہے کہ ہراول دستہ، ریڑھ کی ہڈی، انقلابی، معمار اور قائد وہ ہوگا جو اس مقصد کے بابت قوم کی قیادت و رہنمائی کرے گا جبکہ بی ایس او کی تاریخ کچھ اور بتاتی ہے۔ اس کا قیام خودمختاری کے نعرے سے ہوا، پھر کبھی پارلیمانی قوم پرستی کا داعی یا سردار مخالف رہا، پھر بیرونی حالات سے متاثر ہو کر نعرہ آزادی تک پہنچا، بیرونی حالات کا اثر انداز ہونا ختم ہوا تو پھر کبھی خودمختاری، کبھی حق خودارادیت پھر بدل کر حق خودارادیت بشمولِ حق علیحدگی، تعلیم یافتہ سماج، انٹی سردار سے ہوتے ہوئے جب ایک بار پھر بیرونی حالات کسی اور کے بدولت بدل گئے تو ایک بار پھر بی ایس او آزادی کا نعرہ لگانے لگا۔ یعنی گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران جب بھی بی ایس او نے قومی آزادی کا نعرہ لگایا ہے وہ ان حالات کے مرہونِ منت رہی ہے جو اس نے خود پیدا نہیں کیئے ہیں بلکہ باہر سے ظہور پذیر ہوئے اور ہمیشہ باہر سے کسی نے اسکے منہ میں یہ نعرہ ٹھونسا ہے۔ صرف بی ایس او کے جدید تاریخ پر ایک نظر دوڑائیں کہ اس تحریک کا آغاز آخر بی ایس او سے کیوں نہیں ہوا؟ پہلے بی ایل اے کی مسلح کاروائیاں شروع ہوتی ہیں، حالات میں تبدیلی آنے لگتی ہے پھر بی ایس او آزاد بنتا ہے اور آزادی کا نعرہ بشمولِ ہراول دستے کے نعرے کے ساتھ لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا سوال اٹھتا ہے کہ حقیقی قومی مقصد آزادی کو بی ایس او نا پہچان پاتا ہے اور نا اسکے پیچھے ہوتا ہے بلکہ اس کا آغاز کسی اور کی طرف سے ہوتا ہے پھر بی ایس او کیسے تحریک کا بانی، ہراول دستہ اور قائد ہوسکتا ہے؟ بقول کریمہ بلوچ بی ایس او نے پہلی بار انقلابی سیاست کو متعارف کرایا اور اسکے پڑھے لکھے کارکن جو عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہیں جذباتی نعروں سے نکل کر عملی سیاست کرتے ہیں تو وہی سوال یہاں دوسرے الفاظوں میں سامنے آجاتا ہے کہ آخر کیوں بی ایس او کے پڑھے لکھے، عالمی حالات کا تجزیہ کرنے والے، تربیت یافتہ عملی کارکنان آزادی کے بابت قومی رہنمائی کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکے اور تحریک کا آغاز وہ کرتے ہیں جو بقول آپکے بین اسطور الفاظوں کے انقلابی نعروں سے عاری، کٹر قبائلی ہوتے ہیں؟ یہ قصہ صرف موجودہ تحریک کا نہیں یہی صورتحال ستر کی دہائی

اپنے دورِ بلوغت سے لیکر آج تک بی ایس او کے یہ دعوے سنتا آرہا ہوں کہ، بی ایس او تحریک کا ہراول دستہ ہے، بلوچ سیاست کی ریڑھ کی ہڈی ہے، واحد انقلابی ریڈیکل تنظیم ہے، انقلابی سیاست کا معمار ہے، قائد ہے، نمائندہ ہے، بانی ہے اور پتہ نہیں کیا سے کیا ہے، لیکن اب ذرا حقائق کی طرف جائیں تو یہ بات اب بلا بحث طے شدہ ہے کہ بلوچ مقصد قومی آزادی ہے اور یہی سیاست کا محور ہونا چاہئے پھر اسکا مطلب یہ ہے کہ ہراول دستہ، ریڑھ کی ہڈی، انقلابی، معمار اور قائد وہ ہوگا جو اس مقصد کے بابت قوم کی قیادت و رہنمائی کرے گا جبکہ بی ایس او کی تاریخ کچھ اور بتاتی ہے۔ اس کا قیام خودمختاری کے نعرے سے ہوا، پھر کبھی پارلیمانی قوم پرستی کا داعی یا سردار مخالف رہا، پھر بیرونی حالات سے متاثر ہو کر نعرہ آزادی تک پہنچا، بیرونی حالات کا اثر انداز ہونا ختم ہوا تو پھر کبھی خودمختاری، کبھی حق خودارادیت پھر بدل کر حق خودارادیت بشمولِ حق علیحدگی، تعلیم یافتہ سماج، انٹی سردار سے ہوتے ہوئے جب ایک بار پھر بیرونی حالات کسی اور کے بدولت بدل گئے تو ایک بار پھر بی ایس او آزادی کا نعرہ لگانے لگا۔ یعنی گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران جب بھی بی ایس او نے قومی آزادی کا نعرہ لگایا ہے وہ ان حالات کے مرہونِ منت رہی ہے جو اس نے خود پیدا نہیں کیئے ہیں بلکہ باہر سے ظہور پذیر ہوئے اور ہمیشہ باہر سے کسی نے اسکے منہ میں یہ نعرہ ٹھونسا ہے

میں بھی دیکھنے کوملتا ہے۔ کیا قومی رہنمائی یہ ہوسکتی ہے کہ بی ایس او اپنے پانچ دہائیوں پر محیط زندگی میں دو درجن سے زائد مختلف نعرے لگاچکا ہو اور جب بھی اسکے زبانوں پر آزادی کا نعرہ آیا ہو تو وہ بھی کسی اور کے رہنمائی میں آیا ہو، تاریخ تو پھر یہی ثابت کرتی ہے کہ بی ایس او حقیقی راستے کیلئے خود ہمیشہ کسی اور کے رہنمائی کا محتاج رہا ہے اور جو خود رہنمائی کا محتاج ہو تو کیا وہ کسی طور پر بھی ہراول دستہ، قائد یا بانی کہلایا جاسکتا ہے؟ جب موقف و مقصد تک میں استقلال نہیں رہے اور ایک موقف سنبھال یا پیش نا کرسکیں تو وہ کیسے رہنما ہوسکتا ہے؟ گودی کریمہ کہتی ہیں کہ ہمیشہ طالع آزماوں نے بی ایس او پر اثر انداز ہوکر اسے تقسیم کرکے اپنے ایجنڈوں پر چلایا ہے، میں بی ایس او کے اندرونی آزادی کا حمایتی ہوں لیکن یہاں سب سے بڑا طنز یہ ہے کہ اگر بی ایس او کے تاریخی تناظر و حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو اس پر گر کوئی اثر انداز نہیں ہوتا تو پھر آج بی ایس او آزادی کا نعرہ بھی نہیں لگا رہا ہوتا، یعنی بی ایس او کا وقعت و افادیت بڑھانے اور صحیح راستے پر چلانے کیلئے بی ایس او ہمیشہ اس عمل (بیرونی اثر اندازی) کا محتاج رہا ہے، جو بی ایس او کے سیاسی کلچر میں قبیح ترین فعل تصور ہوتا ہے۔ اب ایک بار پھر وہی سوال گھوم پھر کر آجاتا ہے کہ اس موجودہ تحریک کا آغاز بی ایس او سے کیوں نہیں ہوا؟ کیوں ایک ڈاکٹر اللہ نظر مسلح کاروائیوں سے پہلے ایک بی ایس او آزاد نہیں بناتا ہے؟ اسے کیوں ضرورت پیش آتی ہے کہ پہلے غیر سیاسی و غیر بی ایس او ی لوگ اس تحریک کا آغاز کریں؟۔ ویسے مزے کی بات یہ ہے کہ اگر بی ایس او کے قیام کے مقاصد اور پہلے بی ایس او پر نظر ڈالیں تو اس میں آزادی کہیں نہیں ملے گی بلکہ اگر اس بی ایس او کو حقیقی بی ایس او تسلیم کرتے ہوئے ہم اسے آج ڈھونڈیں تو وہ بی ایس او پجار یا مینگل ہوسکتا ہے لیکن بی ایس او آزاد نہیں اور اگر بی ایس او آزاد کو واحد چیز ان تنظیموں سے ممتاز کرتی ہے تو وہ اسکے آزادی کا نعرہ ہے اور یہ نعرہ بھی اسکی تخلیق نہیں بلکہ اس نے مسلح تنظیموں سے متاثر ہوکر وہاں سے مستعار لیا ہوا ہے یعنی بی ایس او آزاد کا خاصہ و روح اندر سے نہیں پھوٹی بلکہ سے باہر سے آئی۔ اب اگر یہی نعرہ بی ایس او آزاد سے نکال لیں تو اس میں اور پجار میں کوئی فرق نہیں رہے گا، بات کو مزید واضح اور طنز یہ کرکے دیکھیں تو بی بی کریمہ اور ڈاکٹر کہور میں واحد فرق آزادی کے نعرے کا ہے اور یہ نعرہ بی کریمہ کو وہاں سے ملا ہے جس پر میری چھوٹی بہن یہ الزام عائد کرتی ہے کہ انہوں نے بی ایس او کو برباد کیا ہے، یہ دلیل مکمل کرتے ہی میں بی ایس او کے قائدانہ و ہراول دستانہ دعووں کو مسترد کرنے کے پوزیشن میں آجاتا ہوں۔ میرا مقصد ہرگز یہ ثابت کرنا نہیں کہ بی ایس او پر اثر انداز ہونا جائز ہے بلکہ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ بی ایس او آج جو دعووں میں خود کو ظاہر کررہا ہے وہ حقیقت میں بالکل نہیں ہے اور بی ایس او نے کبھی بھی نا اپنے اصل کردار کو سمجھا ہے اور نا اس پر عمل پیرا رہا ہے اور نا اس وقت ہو رہا ہے، اسلئے حقیقی معنوں میں بی ایس او انتہائی کم افادیت کا حامل رہا ہے اور اسکے یہ معمولی فوائد بھی اس وقت بالکل بے معنی ہوجاتے ہیں جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسکے ہوتے ہوئے کوئی اور حقیقی انقلابی طلباء تنظیم بھی بلوچ سماج میں نہیں پل سکی پھر میں بی ایس او کے جمعی حاصل حصول کو منفی اور نقصان قرار دوں گا۔ مجھے ذاتی طور پر بی ایس او ایک انقلابی تنظیم سے زیادہ ایک اشتہاری ادارہ (ایڈورٹائزنگ ایجنسی) لگتا ہے، جسے ہر کوئی ٹھیکے پر لیکر اپنے اشتہارات چلواتا ہے۔ جب مارکیٹ میں اختر جئی کا پروڈکٹ آیا تو یہ انکے اشتہار چلاتا تھا اسی طرح مارکیٹ میں آزادی کے پروڈکٹ کے آنے کے بعد یہ اسکا اشتہار چلاتا رہا پھر ڈاکٹر اللہ نظر کو احساس ہوا کے اس کمپنی پر تو اسکا حق ہے اسلئے انہوں نے بغیر بولی کے سستے دام اسکا ٹھیکہ ناجائز طریقے سے حاصل کرکے صرف اپنے پروڈکٹ کا اشتہار چلوا رہا ہے، اور دنیا کے ہر اشتہاری ادارے کی طرح اپنا مانگ بڑھانے اور خود کو باقی کمپنیوں سے ارفع ثابت کرنے کیلئے بی ایس او کا دوسرا کام ساتھ میں اپنا اشتہار چلانا بھی ہوتا ہے۔ یہ بیان یقیناً طنز یہ ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو آپ کو حقائق ہرگز مختلف نہیں ملیں گے، باریک بینی سے غور کریں بی ایس او کا حاصل حصول (آوٹ پٹ) ابتک کیا رہا ہے، کارکنوں کو چھوڑیں صرف اعلیٰ قیادت بلکہ صرف چیئرمینوں یعنی قیادت اعلیٰ کو ہی دیکھ لیں تو عبدالنبی بنگلزئی، ڈاکٹر اللہ نظر اور بشیر زیب کے علاوہ آپ کو کون نظر آئے گا؟ یعنی درجنوں قومی رہبر و رہنماوں سے صرف تین ٹِک پائے اور ان تینوں کے بندوق کو آئیڈیلائز کرنے کے بجائے ان کے مکمل کردار کو بھی جانچیں پھر فیصلہ کریں کے آیا وہ انکے نام و شہرت کے کماحقہ ہے بھی کہ نہیں یا یہ بھی محض زیادہ ایڈورٹائز شدہ بی ایس او کے پروڈکٹ ہیں؟ ذرا سوچیں میر عبدالنبی بنگلزئی کے چالیس سالہ جہد کا ایک بھی فائدہ سامنے آیا ہے یا کوئی بھی اسکا دین اس تحریک کو ہے؟ یا اسکے سالوں پر محیط تجربات سے ہمارے سیاست پر کوئی ایک مثبت فرق پڑا ہو جسے انہوں نے متعارف کیا ہو؟ نہیں میں اسے بے فائدہ کہوں گا اور ڈاکٹر اللہ نظر کے خود پرستی نے جتنا نقصان دیا وہ اسکے دیئے ہوئے فائدے سے کئی گنا زیادہ ہے بچتا بشیر زیب ہے تو ذاتی تعلق کے بنا پر شاید میں انصاف پر مبنی تجزیہ نا کرسکوں لیکن گو کہ آج تک انکی طرف سے دعوے دیکھنے کو نہیں ملے لیکن پھر بھی ابتک انہیں اپنا کماحقہ کردار ثابت کرنا ہے۔ باقی بی ایس او کا تحریک کو دیئے گئے کارکنوں کا جائزہ لیں تو لاکھوں میں سے آج صرف چند سو ہی نظر آئیں گے، اسی پر ایک دوست نے ایک بار خوبصورت جملہ ادا کیا کہ "آج بی ایل ایف میں غالب اکثریت ان سرمچاروں کی ہے جو چند سال پہلے بی ایس او میں متحرک تھے یا بی ایس او کے کیڈر تھے، انہیں تربیت یافتہ انقلابی درکنار اگر بی ایس او تربیت کرکے انہیں کم از کم اچھا انسان ہی بنالیتا تو آج کم از کم مکران میں عام لوگ ان سے بیزار نہیں ہوتے"۔ اس کے باوجود بھی اگر بی ایس او کی طرف سے کوئی اچھا انقلابی یا اچھا جہد کار تحریک کو نصیب ہوا ہے تو اسکے پیچھے بھی بی ایس او کی تربیت نہیں بلکہ اس شخص کا انفرادی کردار و سوچ رہا ہے، اگر بی ایس او بطور تربیتی ادارہ بلوچ سماج میں انقلابی پیدا کررہا ہوتا تو میرا یقین کریں اس وقت صورتحال اور آزادی پسندوں کی تعداد دونوں بہت مختلف ہوتے، جن کا کریڈٹ اگر بی ایس او اپنے سر لے رہا ہے وہ اس لئے کہ بلوچ طلباء سیاست پر بی ایس او کا اجارہ رہا ہے، کوئی قصداً یا انجانے میں، چاہت کے ساتھ یا مجبوری میں اس سے گذرتا رہا ہے، ان کے کردار کا سہرہ اپنے سر پر سجانا ایسا ہے جیسے تربت سے کوئی نوبل پرائز جیتے تو اس شخص کا

بی ایس اوایک انقلابی تنظیم سے زیادہ ایک اشتہاری ادارہ (ایڈورٹائزنگ ایجنسی) لگتا ہے، جسے ہر کوئی ٹھیکے پرلیکر اپنے اشتہارات چلواتا ہے۔ جب مارکیٹ میں اختر وحئی کا پروڈکٹ آیا تو یہ انکے اشتہار چلاتا تھا اسی طرح مارکیٹ میں آزادی کے پروڈکٹ کے آنے کے بعد یہ اسکا اشتہار چلاتا رہا پھر ڈاکٹر اللہ نظر کو احساس ہوا کے اس کمپنی پر تو اسکا حق ہے اسلئے انہوں نے بغیر بولی کے سستے دام اسکا ٹھیکہ ناجائز طریقے سے حاصل کر کے صرف اپنے پروڈکٹ کا اشتہار چلوار ہا ہے

پرائمری اسکول دعویٰ کرے کہ اسکا کریڈٹ مجھے جاتا ہے کیونکہ وہ یہاں پڑھا تھا، پھر اس اسکول کے فارغ شدہ طلباء کا جمعی بے فیض نتیجہ دیکھنے کے بعد ہم اس بوسیدہ تعلیمی نظام کو ہرگز اس کامیابی کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے کیونکہ اگر کمال ادارے میں ہوتا تو وہ جوہر کمال دوسرے طلباء میں بھی کسی نا کسی حد تک دِکھتا پھر یقیناً سہرا اس شخص کے انفرادی سوچ و محنت کو جائیگا۔ جن تین چیئرمینوں کا نام میں نے لیا ہے ان میں سے بشیر زیب بلوچ کو میں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے سنا ہے کہ میرے تربیت کے پیچھے بی ایس او کے بجائے دوسرے دوستوں کا ہاتھ تھا، اسی طرح میر نبی ہمیشہ بی ایس او کے بجائے بابا مری کو استاد مانتے رہے اور ڈاکٹر اللہ نظر کا مجھے پتہ نہیں لیکن اتنا تو میں جانتا ہوں کے بی ایس او حئی نے کم از کم اسے یہ سوچ نہیں دیا ہوگا بلکہ کہیں اور سے آیا ہوگا۔ تلخیصِ بحث یہ کہ بی ایس او نے آج تک نہ منزل کے بابت قوم کی رہنمائی کی ہے، نہ اپنے تنظیمی سلامیت کو بچا سکی ہے اور نا ہی پانچ دہائی بلوچ طلباء سیاست پر اجارہ رکھنے کے باوجود وہ کما حقہ یا قابلِ ذکر کردار ادا کرسکی ہے اور نا ہی مادر تنظیم و تربیت گاہ کے دعووں کے باوجود نوجوانوں کی تربیت کرسکی ہے۔ اسلئے میں موجودہ رنگ وڈھنگ، طریقہ و سوچ کے اندر بی ایس او کے وجود کا خلاف ہوں۔ میرے خیال میں ہر ذی شعور شخص کو اختلاف ہوگا سوائے اسکے جو اس کمپنی سے اپنے پروڈکٹ کا اشتہار چلوانا چاہتا ہے۔ وگرنہ اس بات سے انکار ہرگز ممکن نہیں کہ بی ایس او کے کردار کو بدل کر از سرنو وضع کرنا ہوگا۔ ایک دفعہ دوستوں بشمولِ سنگت بشیر زیب پر تنقید کرتے ہوئے میں نے پوچھا تھا کہ بی ایس او کے تاریخی پس منظر اور حالات کو جاننے کے باوجود اس وقت بی ایس او کو حقیقی معنوں میں استوار کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی، تو جواب ملا کے اس وقت پوری توانائی بی ایس او کو پارلیمنٹ پرستوں کے نرغے سے نکالنے میں لگ گئی اور پوری کوشش کے بعد اتنا ہوسکا کہ پانچ سال اطمینان بخش نہیں تو تھوڑا بہت اس نے صحیح رخ اختیار کرنا شروع کیا لیکن اس مختصر مدت کے بعد بی ایس او ایک بار پھر کسی اور کے نرغے میں آگئی جو اس بار آزادی پسندوں کی صورت میں تھے، شاید بی ایس او کی بنیاد ہی اس طرح بنا ہوا ہے کہ موم کی ناک کی طرح کسی طرف بھی موڑا جاسکتا ہے، شاید ٹیڑھی بنیاد پر کوئی سیدھی دیوار قائم نہیں ہوسکتی۔ بی ایس او جس طرح پہلے صرف نعروں اور دعووں پر زندہ تھی آج بھی اسی طرح زندہ ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں بی ایس او کے کسی کارکن یا لیڈر کی شہادت کا سنتا ہوں کیونکہ میری نظر میں اتنی قیمتی جان بالکل سستے چیز کیلئے ضائع کی گئی، تحریک میں شہادتیں ناگزیر حصہ ہیں لیکن مجھے اپنے اس کاش پر کوئی قابو نہیں کہ اتنی شہادتیں زیادہ کارآمد اور زیادہ نتیجہ خیز کام میں ہوتیں بلکہ ہونی چاہئے تھی، بی ایس او نا صرف مخلص بلوچ طلباء کی مخلصی اور سچے جذبات کا استحصال کر رہا ہے بلکہ اپنے اشتہار بازانہ سیاست کو ان نوجوانوں کے قیمتی خون سے چلا رہا ہے، اور اس مکروہ دھندے کو دو درجن سے زائد رہنما اسلئے سدھار نہیں رہے کیونکہ اگر بی ایس او صحیح راستے پر چلا تو انکے اشتہار چلنا بند ہو جائیں گے، اور ہمارے جیسے آشفتہ سر جو بلوچ نوجوان کے اس ضیاع پر ماتم کرتے ہیں وہ پھر اشتہاری کمپنی (بی ایس او) کے منفی اشتہار بازی کا شکار ہو جاتے ہیں، ویسے بھی جیسا کے پہلے میں نے کہا کہ بی ایس او نے کسی کو ہیرو اور کسی کو ولن بنانے کے سوا تحریک میں اور کیا ہی کیا ہے؟ ویسے مجھے ایک بات پر کافی ہنسی آتی ہے، ڈاکٹر اللہ نظر و خلیل کو دنیا کے ہر چیز میں ملٹی نیشنل کمپنیاں نظر آتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انکا اپنا سوچ مکمل طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پالیسی سازوں کی طرح استوار ہے، یعنی بی این ایم میں اللہ نظر کچھ اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے اور کچھ کو اختیار کا لالچ دیکر اپنے ساتھ ملاتا ہے پھر اس پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایسے بلواسطہ قبضہ کرتا ہے جس طرح ملٹی نیشنل کمپنیاں کسی ملک میں اپنا ایجنٹ اس ملک کا سربراہ بنا کر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے یہی سلوک بی ایس او کے ساتھ بھی کیا، بی بی کریمہ، حئی و جواد کی صورت میں اسکے ایجنٹوں نے بی ایس او پر قبضہ کر لیا اور اس پر موروثی ملکیت کی طرح ایسے چمٹے ہوئے ہیں کہ کسی طور چھوڑنے پر راضی نہیں۔ اب جو بھی انکے حقیقت سے آگاہ ہو کر سامنے کھڑا ہو جائے تو اسے راستے سے ہٹانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بی بی کریمہ سمیت باقی قابضین کو لگتا ہے شاید ریاست اور تنظیم ایک ہی طرح ہوتے ہیں، جیسے کسی ریاست میں ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھ اقتدار کی کرسی لگے تو وہ سالوں سب کو کچل کر اس سے چمٹے رہتا ہے، اسی طرح انہوں نے بی ایس او آزاد کے نام کو وہی کرسی سمجھ کر قبضہ کر کے اس کی جاگیر کی طرح حفاظت کر رہے ہیں، لیکن کاش کوئی جا کر انہیں سمجھائے کہ ایک انقلابی تنظیم کسی کرسی کی

طرح نہیں ہوتا جو قسمت سے ہاتھ لگا تو پھر زندگی سنور گئی بلکہ یہاں کل اساس بلکہ وجود کوئی عہدہ یا کرسی نہیں بلکہ وہ اعتماد ہوتا ہے جو لوگوں کی طرف سے حاصل ہوتا ہے۔اب بی بی کریمہ وڈاکٹر اللہ نظر اس بی ایس او آزاد اور اسکے چیئر مین شپ کو اپنے نام پیٹنٹ بھی کروالیں تو کوئی مسئلہ نہیں ان کے ہاتھ اب صرف نام رہ چکا ہے، وہ اس تنظیم اور اسکے سربراہی کیلئے عوامی اعتماد اور اخلاقی جواز مکمل طور پر کھو چکے ہیں اور ان دو عناصر کے سوا بی ایس او آزاد یا کوئی بھی تنظیم ہے ہی کیا؟ محض ایک نام اور مردہ جسم؟ اسکی حقیقی روح آہستہ قبض ہوتے ہوتے نکل گئی، اب کم از کم مجھے کوئی مسئلہ نہیں بی بی کریمہ اسکا تاحیات چیئر مین بنتی ہیں یا اللہ نظر ایجنٹس بدلتا رہے کیونکہ اسکی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔اسی بات کو لیکر ایک دوست نے مجھ سے ایک اہم سوال پوچھا کہ اگر اسکی اہمیت اب ختم ہو چکی ہے تو پھر آپ بی ایس او اور اسکے قیادت (خود ساختہ) پر کیوں تنقید کرتے ہیں میرا جواب سادہ سا تھا'' تاکہ نوجوان نام کے دھوکے میں اسکے آسیب کا شکار نا ہو جائیں، انہیں پتہ چل جائے کہ اگر وہ مخلصی کے ساتھ تحریک کیلئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو وہ جگہ بی ایس او نہیں لیکن اگر وہ اشتہار بازی یا کسی مخصوص مفاد یا ذاتی تعلق داری کیلئے جانا چاہتے ہیں تو پھر بالکل جاسکتے ہیں، میں تو ایک نوجوان کے مخلصی، جذبات اور خون کا استحصال روکنا چاہتا ہوں اور جب تک یہ استحصال جاری رہے گا، ہماری ادنیٰ کوشش بھی جاری رہے گی'' اسکے بعد ایک بہت ہی جائز سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ غلط ہے تو پھر نوجوان جائیں بھی تو کہاں جائیں؟ میرا سادہ سا جواب ہے یا تو کسی معجزے یا کرامت کا انتظار کریں کہ بی ایس او کی یہ خود ساختہ قیادت ہوش کے ناخن لیکر اسکی از سرِ نو حقیقی تعمیر کریں اب بدقسمتی سے معجزوں کا دروازہ تو بند ہو چکا ہے تو پھر بی ایس او کے روایتوں کو توڑ کر کسی باہری مددگار کا تلاش چھوڑ کر نوجوان خود ہی آگے آئیں اور ایک حقیقی تعمیر کا آغاز کریں۔مضمون کا آغاز میں نے دعووں اور حقائق کے بیچ کے فرق اور بی بی کریمہ کے حالیہ ایک بیان اور ایک آرٹیکل سے کیا۔اسکا مقصد یہ ہے کہ آج پھر شعلہ بیانیوں، بے بنیاد اور حقائق سے متضاد دعووں کی مدد لیکر بی بی کریمہ کھوئی ہوئی ساکھ اور تنظیم کے بے وقعتی کو بچانا چاہتا ہے۔پوری تاریخ میں دھوکوں کے بعد اب کم از کم ہمیں اپنے تجزیوں کا مطمع نظر دعووں کے بجائے حقائق بنانا چاہئے۔کم از کم ان کے بیچ کے تضادات کو سمجھنا چاہئے۔اپنے ان چند لائنوں میں ہی بی بی کریمہ کبھی کہتی ہے کہ بی این ایف کی صورت میں ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر اتحاد موجود ہے پھر اگلے ہی جملوں میں بین کرتے ہوئے یہ کہتی نظر آتی ہے کہ عالمی حالات کے تناظر میں ہمیں ایک مضبوط تنظیم یا اتحاد کی ضرورت ہے۔اب سوال اٹھتا ہے کہ جس بی این ایف کے صفت وثنائی میں پورا کاغذ آپ نے سیاہ کیا وہ آخر کیوں عالمی حالات کے تناظر کے مطابق وہ مضبوط پارٹی نہیں بن سکی اگر وہ ہے تو پھر آپ کو ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے اگر وہ نہیں ہے تو پھر اسکی صفت وثنائی چہ معنی دارد؟ حیرانی ہوتی ہے وہ تمام کارکنان جو بی ایس او کو چھوڑ کر چلے گئے، آج بی بی کریمہ کے دعووں کے مطابق انہیں اس نے اصل میں نکال دیا تھا۔اب یہ دعوے یقین کریں مزاحیہ لگنے لگیں ہیں اس سے زیادہ حوصلہ افزاء بات یہ ہے کہ، اس تنقیدی سلسلے کو جاری رکھنے کیلئے گوکہ دوستوں کو گالیوں سے لیکر تمغوں تک سب برداشت کرنا پڑا لیکن کم از کم بلوچ نوجوانوں کا سوچنے اور پرکھنے کا انداز اب بدل رہا ہے، ایک نوجوان جو بی ایس او کا کوئی یونٹ سطح کا عہدیدار ہے کافی وقت سے میرے ساتھ فیس بک پیغامات کی صورت میں بحث ومباحثہ کرتا رہتا ہے اس مضمون کو لکھنے کے دوران اسی دوست کا ایک میسج آیا میں اسکی باتیں اس مضمون میں شامل کرنے سے خود کو نہیں روک سکتا تاکہ آپ بھی اس مثبت تبدیلی کو محسوس کریں۔وہ دوست کہتا ہے ''سنگت آپ نے بانک کا بیان پڑھا کتنا پر تضاد ہے، بانک ہر وقت کہتی ہیں کہ فیس بک پر ہونے والی تنقید اسکے تنظیم کے معاملات میں دخل اندازی ہے لیکن اپنے بیان میں بی ایل اے کا یو بی اے کے ساتھ محاذ آرائی پر وہ تنقید کرتی ہے، پھر بانک کے منطق پر ہم پرکھ کر دیکھیں تو کیا یہ بی ایل اے کے تنظیمی معاملات میں مداخلت نہیں؟ بانک تو تنظیم کو کنویں میں پہلے سے ہی لیجا رہی ہے اب ہم سب کو کنویں میں پھینکنا چاہتی ہے، ایک طرف تو ریاست ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے، اب بانک اپنے بیان میں خود کہتی ہیں کہ ہم نے ثالث کی حیثیت سے مسلح تنظیموں سے رابطہ کیا اور ثالثی کرتے رہیں گے یعنی وہ خود تسلیم کر رہی ہے کہ ہمارے رابطے مسلح تنظیموں سے ہیں اور پھر بعد میں کہتی ہے کہ ہمارے کارکنوں کو سوشل میڈیا پر ظاہر کیا گیا اسلئے وہ شہید ہو رہے ہیں، اور حقیقت میں وہ خود برملا میڈیا میں تعلقات کے بارے میں اعتراف کر رہی ہے اور اب ہم سے یہ فرمائش کے ہم اوپن کام کریں''۔

☆۔بی ایس او کے اندرونی چشم کشا حقائق و اعترافات

شہرہ آفاق فلسفی اور تاریخ دان ویل ڈیورانٹ ترقی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ترقی بے ترتیبی پر ذہن اور مقصد کے غلبے، مادے پر ہیت اور عزم کے غلبے کا نام ہے''۔ترقی کے اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں، مضمون کے پہلے حصے میں، میں نے اس امر کے حق میں دلائل دینے کی کوشش کی تھی کہ بی ایس او اپنے موجودہ وضع و قطع میں قومی تقاضوں اور ضروریات کو پوری کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور تاریخی طور پر اسکا وجود مجموعی حاصل کے تناظر میں فائدہ سے زیادہ نقصان کی طرف دلالت کرتا ہے۔ذرا بی ایس او کے متعلق مندرجہ ذیل قطعی سچائیوں پر غور کریں ''بی ایس او کے اندر کوئی بھی آسانی سے آسکتا ہے اور اعلیٰ ذمہ داریوں تک پہنچ سکتا ہے''، ''بی ایس او کو کوئی بھی سیاسی، قبائلی یا عسکری شخص باآسانی اپنے ایجنڈے پر چلا سکتا ہے''، ''بی ایس او کی افادیت تنظیمی ساخت کے بجائے انفرادی کوششوں پر منحصر ہوتا ہے، یعنی کوئی اچھا چیئر مین آیا تو تنظیم صحیح اور کوئی غلط چیئر مین آیا تو تنظیم غلط کی طرف رواں''، ''بی ایس او کو کسی بھی وقت توڑا جاسکتا ہے''، ''بی ایس او میں اختیار صلاحیت نہیں بلکہ لابنگ کے بل بوتے پر حاصل ہوتا ہے''، ''بی ایس

او کے اندر کبھی بھی اختلافات کے صورت میں تنظیم کے اندر رہتے ہوئے قیادت تبدیل نہیں کی جاسکتی ہمیشہ ایسے شخص کو نکالا جاتا ہے یا نکل جاتا ہے‘‘ ’’بی ایس او کبھی بھی کسی طویل المدتی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوسکا‘‘ ’’بی ایس او کبھی بھی موضوعیت پسندی سے باہر نہیں آسکا‘‘ ’’بی ایس او کبھی بھی ردعملی سیاست سے چھٹکارہ نہیں پاسکا‘‘ وغیرہ۔ بی ایس او کے بابت ان سے زیادہ، ان سے بہتر مزید قطعی سچائیاں بیان کی جاسکتی ہیں اور جن سے انکار بھی ہرگز ممکن نہیں۔ ان امور پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر با آسانی پہنچا جاسکتا ہے کہ بی ایس او ہمیشہ بے ہنگم پن، بے ترتیبی اور بے مقصدیت کا شکار رہا ہے، اب اسی نقطے پر ویل ڈیورانٹ کے ترقی کی تعریف کا انطباق کرکے دیکھیں تو معلوم پڑتا ہے یہاں کبھی ذہن اس بے ترتیبی پر غلبہ حاصل نہیں کرسکا اسلیئے مقصد بھی غلبہ حاصل نہیں کر پایا یعنی بی ایس او بطور تنظیم ترقی کرنے میں ناکام ہے۔ بی ایس او کے وجود کی بے سودی سے قطع نظر اس پر ہونے والی موجودہ تنقید کا مطمع نظر اسکے وجود سے انکار نہیں بلکہ اسکا ترقی رہا ہے۔ یہاں تاریخی پس منظر ایک نظر ڈالنے کا متقاضی ہے، موجودہ قومی تحریک کا آغاز، نوجوانوں میں شعور آزادی بیدار کرنے کیلئے رابطے، بی ایس او آزاد کا قیام، عوام میں پذیرائی، بی ایس او استار کا ضم ہوکر بی ایس او متحدہ بن جانا، سنگل بی ایس او کا قیام، پھر پارلیمانی پارٹیوں کی روایتی کھینچا تانی، ایک بار پھر بشیر زیب کا بی ایس او آزاد کو تشکیل دینا، مختصر وقت میں بے حد پذیرائی، ریاستی جارحیت اور ڈاکٹر اللہ نظر کا بی ایس او آزاد کیلئے پارلیمانی جماعتوں جیسی چال بازیاں، ایک بار پھر بی ایس او آزاد پاکٹ تنظیم بن کر جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں پر ختم ہونا۔ میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ 2006 میں بی ایس او آزاد کے قیام کے بعد سے

ڈاکٹر اللہ نظر و خلیل کو دنیا کے ہر چیز میں ملٹی نیشنل کمپنیاں نظر آتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انکا اپنا سوچ مکمل طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پالیسی سازوں کی طرح استوار ہے، یعنی بی این ایم میں اللہ نظر کچھ اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے اور کچھ کو اختیار کا لالچ دیکر اپنے ساتھ ملاتا ہے پھر اس پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایسے بلواسطہ قبضہ کرتا ہے جس طرح ملٹی نیشنل کمپنیاں کسی ملک میں اپنا ایجنٹ اس ملک کا سربراہ بنا کر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے یہی سلوک بی ایس او کے ساتھ بھی کیا، بی بی کریمہ، حئی وجواد کی صورت میں اسکے ایجنٹوں نے بی ایس او پر قبضہ کرلیا اور اس پر موروثی ملکیت کی طرح ایسے چمٹے ہوئے ہیں کہ کسی طور چھوڑنے پر راضی نہیں۔ اب جو بھی انکے حقیقت سے آگاہ ہوکر سامنے کھڑا ہو جائے تو اسے راستے سے ہٹانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

بشیر زیب کے چیئرمین رہنے تک بی ایس او کے افکار و کردار مثالی اور اسکے حقیقی ذمہ داریوں کے کماحقہ تھے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت بی ایس او کے چار عشروں پر محیط بے ہنگم پن اور بے ترتیبی پر غلبہ پانے کیلئے کوششوں کا آغاز ضرور کیا گیا تھا، شاید یہ راتوں رات والا کام نہیں تھا لیکن اس جانب پیش قدمی ضرور کی جاچکی تھی، بی ایس او شاید مکمل آزاد نہیں ہو پایا تھا لیکن اس حد تک ضرور ہوسکا کہ پہلی بار وہ کسی شخص یا تنظیم کے بجائے ایک فکر کا مجموعی طور پر طلباء میں نمائندہ تھا اور نا ہی اسے کسی تنظیم کے ماتحت بنانے کی کوشش کی گئی اسی لیئے بشیر زیب نے مدت پوری ہونے کے بعد تنظیم پر اپنا کوئی لابی مسلط کرنے کے بجائے اگلی لیڈر شپ کے ہاتھوں میں دے دی، لیکن پسِ پردہ ڈاکٹر اللہ نظر اپنے ذاتی و گروہی ایجنڈے کی تکمیل کیلئے دوبارہ انہی چالبازیوں میں مصروف ہوگئے جو ہمیشہ پارلیمانی قوم پرستوں کا وطیرہ رہا ہے، وہ بی ایس او کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے ملاقات کرتے ہیں، پھر اچانک سابق چیئرمین کو اعتماد میں لیئے بغیر بانک کریمہ کی قیادت میں ایک آرگنائزنگ باڈی کی تشکیل ہوتی ہے، یہ آرگنائزنگ باڈی متنازعہ فیصلہ کرتے ہوئے پہلے سے چنندہ تمام کونسلران کو بائی پاس کرتے ہوئے نئے کونسلران کا چناو کرتا ہے جن میں سے 95 فیصد کا تعلق صرف مشکے و مکران سے ہوتا ہے، اس دوران ایک ایڈوائزنگ کمیٹی بھی تشکیل دی جاتی ہے جس میں کچھ سابق چیئرمینوں ڈاکٹر اللہ نظر، عبدالنبی بنگلزئی اور بشیر زیب بلوچ کو شامل کیا جاتا ہے اور کونسل سیشن ایک مسلح تنظیم کے بالکل بغل میں منعقد کی جاتی ہے اور حیرت ناک انداز میں عبدالنبی بنگلزئی سے دوری کی وجہ سے رابطہ نہیں ہوتا اور بشیر زیب بلوچ کو کونسل سیشن سے ایک دن پہلے اطلاع دی جاتی ہے کہ خراب حالات میں میلوں کی مسافت طے کرکے آجائے جو بہرحال ناممکن تھا اور یہ متنازعہ کونسل سیشن صرف پچاس کے قریب من پسند کونسلران کی مدد سے ڈاکٹر اللہ نظر اور اختر ندیم کے موجودگی میں منعقد ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ ایک باضابطہ منصوبے اور سازش کے تحت بی ایس او آزاد کو ڈاکٹر اللہ نظر کے منظور نظر ٹولے و ایجنٹوں کے ذریعے یرغمال بنایا جاتا

ہے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں پہلے درونِ خانہ بی ایس او آزاد پر تنقید ہوئی، اسکی قیادت تک خدشات پہنچائے گئے، رابطے اور ملاقاتیں کر کے تحفظات کا اظہار کیا گیا کیونکہ اتنے سالوں بعد بی ایس او کو بمشکل اس راستے پر لگایا گیا تھا جس پر چل کر وہ آہستہ آہستہ خود میں تبدیلی لاتے ہوئے ارتقائی عمل سے گذر کر ایک ترقی یافتہ اور حقیقی شکل اختیار کر سکتی تھی لیکن اس طرح دوبارہ بی ایس او کو وہی پرانی باجگزاری کے رستے پر چلا کر نا صرف اسکے ارتقائی عمل کے سامنے ایک رکاوٹ پیدا کیا جا رہا تھا بلکہ اسے طلباء میں ایک فکر کے نمائندے کے بجائے ایک تنظیم بی ایل ایف اور ایک شخص اللہ نظر کا نمائندہ بنایا جا رہا تھا۔ بات صرف یہاں تک نہیں رکی جن امور پر درونِ خانہ تنقید ہو رہی تھی اور خدشات کا اظہار کیا جا رہا تھا آہستہ آہستہ وہ ظاہر ہونے لگے، بی ایس او آزاد کو بی این ایف کے توسط سے بی این ایم و بی ایل ایف کا باربردار بنایا جانے لگا اور طلباء کے فرائض میں اب بی این ایم و بی ایل ایف کے جوتے سیدھا کرنے کا فرض شامل ہو گیا، اس پر تنظیم کے اندر اختلافات نے جنم لیا جنہیں انتہائی بھونڈے انداز میں دبا دیا گیا جس کے وجہ سے پہلی بار بی ایس او کے مسائل اور اس پر تنقید بند دیواروں سے نکل کر میڈیا میں آ گئی سب سے پہلے لندن زون کو فارغ کیا گیا سوچا گیا مسئلہ ٹل گیا، لیکن ایک بار پھر اندر بی ایس او کے قیادت کے طرزِ عمل پر تنقید شروع ہوئی ایک بار عرصہ حیات تنقید کرنے والوں کیلئے تنگ کیا گیا اور ایک بار پھر یہ مسائل تنظیم سے نکل کر میڈیا کا زینت بی ایس او کے مرکزی انفارمیشن سیکریٹری کی صورت میں سامنے آ گئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے آدھی سے زائد تنظیم ڈاکٹر اللہ نظر کے مسلط کردہ ایجنٹوں کے خلاف بغاوت پر اتر آئی اور تقریباً تنظیم کے دس زونوں نے مرکز کا بائیکاٹ کرتے ہوئے تنظیم کے اندر ہی ایک آئینی بلاک بنا کر خود سے ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں پر بھی بات ختم نہیں ہوئے ایک بار پھر اندر اختلافات اور تنقید نے جنم لیا اور اس بار مرکزی کمیٹی کے دو ارکان کو بہن کریمہ نے صرف اسلئے تنظیم سے نکال دیا کیونکہ انہوں نے مرکزی پالیسیوں پر اپنے کارکنوں کے سامنے تنقید کی تھی، انہیں نکال کر شاید سکون کا سانس لیا گیا ہو گا لیکن معاملات ختم نہیں ہوئے تنظیم کے اندر ڈاکٹر اللہ نظر کے مسلط کردہ ٹولے بانک کریمہ، جواد اور حئی پر تنقید شروع ہوئی ایک بار پھر قدغن لگی اور اس بار نکالے جانے کے بجائے مرکزی کمیٹی کے تین ارکان نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اس سلسلے کو دیکھا جائے تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ شاید آگے بھی نہیں رکے گا اور غلط و باجگزاری کے خلاف اسی طرح وقفے وقفے سے لوگ اندر سے اٹھتے اور نکلتے جائیں گے۔ اب اگر مجموعی حساب سے دیکھا جائے تو بی ایس او آزاد کی جو قیادت 2012 میں متنازعہ طور پر چنا گیا تھا اسکی واضح اکثریت نکل چکی ہے یا نکالی جا چکی ہے جب اکثریت نکل جائے تو پھر دنیا کے کسی بھی قانون میں اقلیت کو تنظیم کا نمائندہ یا لیڈرشپ تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ اب اگر غور کریں تو بی ایس او آزاد میں آپکو مسلط کردہ تین کا ٹولہ ہاتھوں میں صرف نام کا کٹورہ لیئے گھوم رہا ہے۔ گذشتہ دو سالوں سے بی ایس او آزاد پر اگر میڈیا میں تنقید ہو رہی ہے تو اسکا بنیاد مختصراً انہی بیان کردہ امور پر ہی رکھی ہے۔ مندرجہ بالا باتوں کو شاید پہلے بھی کئی بار بیان کیا جا چکا ہے، لیکن بی ایس او آزاد کی غیر قانونی قیادت ہر بار انہیں بغیر دلائل کے محض جھوٹ، پروپیگنڈہ اور سازش قرار دیکر مسترد کرتی رہی ہے اور گذشتہ دن بی ایس او کے ناجائز قائم مقام چیئرپرسن بانک کریمہ بلوچ نے اپنے ایک بیان میں اس ''جھوٹ اور پروپیگنڈے'' کا سرغنہ اسلم بلوچ، حسن جانان اور سلام صابر کو قرار دیا۔ اس شعلہ بیانی و ہرزہ سرائی کے پیچھے اپنے ناکامیوں و سیاہ کارناموں کو چھپانے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن بی ایس او آزاد ہو یا اسکے اتحادی نام نہاد مڈل کلاس ان کی شروع سے کوشش یہی رہی ہے کہ جھوٹ، جذبات اور لاشوں پر سیاست کر کے بلوچ رائے عامہ کو گمراہ کیا جائے۔ نا کوئی تنظیم کسی کا ذاتی اجارہ ہے اور نا ہی قومی تحریک اگر ایسے گمراہ کن مفروضات اور ذات پرست ٹولوں کی حقیقت آشکار نہیں کیا گیا تو یہ ماضی کی طرح قومی تحریک کو ایک اندھیری کھائی میں دھکیل کر اپنے ذات کو سنوار کر خود کہاں غائب ہو جائیں گے کانوں کان خبر نہیں ہو گی اور خمیازہ صرف قوم بھگتے گی اسلئے یہاں میں بی ایس او آزاد کے کچھ اندرونی حقائق کو بلوچ عوام کے سامنے رکھنا چاہوں گا، جن کو اب تک نوکِ قلم پر نہ لانے کا مقصد محض رازداری کا پاس رہا تھا لیکن اب وہ بے معنی لگتی ہے جس سے ثابت ہو جائیگا کہ گذشتہ دو سالوں کے دوران بی ایس او پر جتنی تنقید کی جاتی رہی ہے وہ اسلم بلوچ، حسن جانان اور سلام صابر کی رچائی گئی سازش نہیں بلکہ وہ حقائق ہیں جن کو یہ نام نہاد ٹولہ جھوٹ و فریب سے لوگوں کے آنکھوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ پچھلے ماہ مجھ سے ایک پرانے شناسا نے رابطہ کیا جو تادمِ تحریر بی ایس او آزاد کے کسی زون کا ذمہ دار ہے، بی ایس او کے اس اندرونی خلفشار کو موضوعِ بحث لانے اور اپنی پریشانیاں و خدشات بیان کرنے کے بعد اس نے مجھے حال میں بی ایس او سے مستعفی ہونے والے تین مرکزی ارکان کے بارے میں بتایا اور انکے اختلافات کی نوعیت سے آگاہ کیا، پھر موصوف نے مجھے ان تین ارکان کے استعفے اس شرط پر ارسال کر دیئے کہ میں انہیں میڈیا میں ظاہر نہیں کروں گا لیکن موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر جب مجھے انکی اہمیت کا احساس ہوا تو اب میں مذکورہ دوست کے اجازت سے ان استعفوں کا متن اور اختلافات کی نوعیت سب کے سامنے رکھنا چاہوں گا جو ہرگز اس تنقید سے مختلف نہیں جسے بی بی کریمہ بیرونی سازش قرار دیتی رہی ہے۔ بقولِ موصوف یہ تینوں بی ایس او آزاد کے متحرک و ''وفادار'' کارکن تھے، تنظیمی لٹریچر و میڈیا کو انہوں نے سنبھالا ہوا تھا، آپ کو یاد ہو گا بی ایس او آزاد نے چند ماہ پہلے ایک سوشل میڈیا کمیٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایک پیج کے ذریعے سے اپنے اوپر عائد الزامات اور ''منفی پروپیگنڈہ'' کا جواب دینگے جو کچھ ہی دنوں میں چند تحریروں کے بعد غائب ہو گئی تھی اور ان تحریروں کا جواب راقم اپنے مضامین میں دے چکا ہے دراصل وہ کمیٹی اور وہ پیج بھی یہی تینوں ارکان سنبھالے ہوئے تھے اور وہ آرٹیکل جو تادمِ تحریر اس پیج پر موجود ہیں انہی ارکان کے تحریر کردہ ہیں۔ میں ان استعفوں کے متن سے چند اہم نکات یہاں حقائق کو سامنے رکھنے کی خاطر پیش کروں گا۔ انکے حقیقی ہونے کی تصدیق میرے خیال میں بی بی کریمہ سمیت بی ایس او آزاد کے پورے مرکز سے کی جا سکتی ہے۔ میں تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں انکا نام بدل کر فرضی ناموں شادمان بلوچ،

بی ایس او آزاد ہو یا اسکے اتحادی نام نہاد مڈل کلاس ان کی شروع سے کوشش یہی رہی ہے کہ جھوٹ، جذبات اور لاشوں پر سیاست کر کے بلوچ رائے عامہ کو گمراہ کیا جائے۔ نا کوئی تنظیم کسی کا ذاتی اجارہ ہے اور نا ہی قومی تحریک اگر ایسے گمراہ کن مفروضات اور ذات پرست ٹولوں کی حقیقت آشکار نہیں کیا گیا تو یہ ماضی کی طرح قومی تحریک کو ایک اندھیری کھائی میں دھکیل کر اپنے ذات کو سنوار کر خود کہاں غائب ہو جائیں گے کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور خمیازہ صرف قوم بھگتے گی

ولید بلوچ اور عاصم بلوچ سے انکا موقف رکھوں گا۔ یاد رہے یہ تینوں اشخاص میڈیا میں آنے کے بجائے تنظیم کے اندر ہی استعفوں پر اکتفاء کر بیٹھے اور ابتک استعفوں کے بعد بھی بی ایس او آزاد سے اپنی وفاداری کا دم وہ کچھ یوں بھرتے ہیں کہ عاصم بلوچ بلوچی میں لکھتا ہے ''من گل ءِ تہ ءَ بہ باں یا مباں کابینہ ءُ بنجاہی مجلس ءِ ھوار گل ءِ تیوگیں باسک پہ من ھاوڑ قابلِ احترام انت۔ ءُ اے ھم واضح کنگ لوٹ آں کہ من نہ وت چشیں عملے کن آں ءُ نہ کہ چشیں عملے ءِ بہر جوڑ باں کہ آئی ءَ چہ گل ءَ انچکیں ھم تاوانے بہ رسیت۔'' اور شادمان بلوچ ایک جگہ کہتا ہے کہ ''میں ان رویوں کو لیکر میڈیا میں جا سکتا تھا لیکن میں نہ میڈیا میں جاؤں گا اور نہ ہی تنظیم سے باہر کسی شخص سے ان مسائل کا ذکر کروں گا بلکہ تنظیم کے اداروں کے اندر ہی یہ نقاط رکھوں گا تاکہ یہ نقاط تمام ذمہ داروں اور کارکنان تک پہنچ جائیں وہ خود ان پر سوچ کر تنظیم کو بچانے کیلئے کمربستہ ہو جائیں احتجاجی طور پر میں استعفیٰ اس لیئے دے رہا ہوں کہ اب میں ایک مسلح تنظیم کو اپنا دشمن بنا کر اور ایک کو دوست بنا کر کام نہیں کر سکتا ہمارے لئے سب برابر ہونے چاہئے'' اور آگے اسی ضمن میں ولید بلوچ کہتا ہے کہ ''میں یہ یقین دہانی بھی کراتا ہوں کہ استعفے کے بعد کسی بھی ایسے عمل کا حصہ نہیں رہوں گا جس سے بی ایس او آزاد کی ساکھ متاثر ہونے کا خدشہ ہو''۔ ان باتوں کو بیان کرنے کے مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ آگے ان مستعفی ارکان کے توسط سے جو باتیں میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ اسلم بلوچ، حسن جانان اور سلام صابر کی نہیں بلکہ بی ایس او آزاد کے اپنے وفادار کارکنوں کی ہیں اور ان کا تعلق سوشل میڈیا پر جاری تنقید سے نہیں بلکہ ان تلخ حقائق سے ہیں جن سے بی ایس او کے کارکن متاثر ہو رہے ہیں۔ گذشتہ ایک طویل عرصے سے اس امر پر تنقید ہو رہی ہے کہ بی ایس او آزاد کو ڈاکٹر اللہ نظر کے ٹولے نے یرغمال بنا کر اس کو بی ایل ایف کا باجگزار بنایا ہوا ہے اسی لیئے اس مسلط کردہ ٹولے کا رویہ ہر اس شخص کے ساتھ انتہائی جارحانہ ہے جو ان سے تنظیم کے اندر رہتے ہوئے بھی اختلاف رکھتے ہیں اور انہوں نے تنظیم کو مکمل طور پر جانبدار بنایا ہوا ہے، اس بات کی تصدیق ان تینوں ارکان کے استعفوں کے بنیادی وجوہات پڑھنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ جیسے کے عاصم بلوچ کہتا ہے ''اے وڑیں رویہ صرف اور صرف اختلاف رائے ءِ گٹ گیر کنگ ءِ واستہ دارگ بوگ ءَ انت۔ بازیں سوچ ءُ بچار ءِ پد من اے آسر ءَ رستگ آں کہ اے وڑیں رویہ ءَ آں گوں جمہوری و انقلابی تنظیم دیم ءَ شُت نہ کن آں ءُ گل ءِ تہ ءَ عرصہ حیات ھنچو تنگ کنگ بوتگ کہ گیشتر نندگ نہ بیت'' اور اس بات کو مزید تقویت شادمان بلوچ کے اس بات سے ملتا ہے کہ ''تنظیم کے مرکزی جانبدارانہ پالیسیوں اور قیادت کے غیر سیاسی رویوں کی وجہ سے میں مرکزی کمیٹی کے عہدے سمیت اپنی بنیادی رکنیت سے مستعفی ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر نہ مجھے کوئی رنجش ہے، نہ کسی سے ذاتی اختلاف اور نہ ہی پریشانی استعفیٰ کی بنیادی وجہ وہ پالیسیاں اور رویے ہیں جو مجموعی طور پر نہ صرف تنظیم کیلئے بلکہ قومی تحریک کیلئے نقصان کا باعث بنتے جا رہے ہیں'' اور بی ایس او آزاد کی باجگزاری کی مزید توثیق ولید بلوچ کے ان باتوں سے ہوتی ہے ''میرے استعفیٰ کی وجہ تنظیم میں موجود عدم برداشت پر مبنی رویئے اور کابینہ ممبران کی جانب سے بیشتر معاملات میں تنظیم کے پالیسی ساز ادارے مرکزی کمیٹی کو بائی پاس کرنا شامل ہے''۔ اب میرے خیال میں شک کی گنجائش نہیں رہتا کہ بی بی کریمہ کی طرف سے گھڑے ہوئے یہ مفروضات کہ بی ایس او آزاد کو اسلم بلوچ، حسن جانان اور سلام صابر یرغمال کرنا چاہتے ہیں سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں درحقیقت ان باتوں سے واضح اشارے ملتے ہیں کہ حقیقت میں بی ایس او آزاد کو یرغمال کوئی اور نے کیا ہوا ہے آگے جس کی مزید وضاحت ہوگی۔ اپنے گذشتہ بیان میں بی بی کریمہ نے ایک الزام لگایا تھا کہ بی ایس او کے اندر آئینی بلاک ایک بیرونی سازش کا نتیجہ ہے تاکہ بی ایس او آزاد کو توڑا جائے اور بہت جلد وہ آئینی بلاک الگ بی ایس او بنائے گا۔ ویسے شیر آیا شیر آیا کے مصداق بی ایس او آزاد کی ناجائز قیادت کافی وقت سے یہ کہہ رہی ہے کہ یہ آئینی بلاک الگ تنظیم بنے گی لیکن ابتک نہیں بنا، اس دعوے کے پیچھے اصل میں انکی باجگزار اور منفی ذہنیت کارفرما ہے یعنی ایک طرف سے آئینی بلاک کافی عرصے سے احتجاج کر رہی ہے، بلوچ دانشوروں اور دوسرے غیر متنازعہ اشخاص سے مل رہی ہے کہ ہمارے مسائل حل کیئے جائیں لیکن بی بی کریمہ ان سے بات تک کرنے کو راضی نہیں اب ظاہر ہے تقریباً نو ماہ گذرنے کے بعد یہ ہٹ دھرمیاں دیکھ کر بالآخر آئینی بلاک کوئی نا کوئی قدم اٹھا سکتی ہے، اب ایک طرف تو بانک کریمہ ڈاکٹر اللہ نظر کے ایماء پر ہٹ دھرمی پر

اڑی ہوئی ہے اور دوسرے طرف آئینی بلاک کے کسی بھی ممکنہ قدم کو پہلے سے ہی متنازعہ بنانے کی کوشش میں بی بی کریمہ شیر آیا شیر آیا کہہ کر چیخ بھی رہی ہے، چلو اس بات کو نہ سلام صابر وغیرہ کے زاویے سے دیکھتے ہیں اور نہ ہی آئینی بلاک کے زاویے سے اس بات کو بھی ایک مستعفی بی ایس او کے وفادار کارکن کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آئینی بلاک کے بارے میں شادمان بلوچ کے استعفے کے متن میں تحریر شدہ یہ نکات یقیناً طلباء سیاست کو برباد کرنے کا جرم بانک کریمہ اور مسلط شدہ گروہ پر عائد کرنے کیلئے کافی ہیں۔ شادمان بلوچ کہتا ہے "ابتداء میں کچھ لندن زون اور کچھ سینٹرل کمیٹی کے ارکان کا مسئلہ ہوا تھا تو اسکی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ تنظیم کے اندر اختلافِ رائے کو جگہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے معاملات میڈیا میں چلے گئے اور اسے بہانہ بنا کر انہیں فارغ کیا گیا لیکن میں انہیں معمولی مسئلے سمجھ کر ہر جگہ تنظیم کا دفاع کرتا رہا، پھر انہی رویوں کی وجہ سے تنظیم کے اندر ایک گروپ بننے لگا ایک تنظیم کے اندر کام کرنے کے باوجود دونوں گروپوں میں اختلاف انتہاء تک پہنچی لیکن پھر بھی ماضی سے سبق نہ سیکھ کر انکے اختلافِ رائے کو تنظیم میں جگہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے انفارمیشن سیکریٹری کے سربراہی میں وہ گروپ میڈیا میں چلی گئی جسے بعد میں بہانہ بنا کر انہیں فارغ کیا گیا" آگے شادمان بلوچ کا یہ اعتراف بانک کریمہ کے دعووں کی قلعی کھولتی ہے اور بتاتی ہے کہ آئینی بلاک کے پیچھے کوئی بیرنی ہاتھ نہیں بلکہ وہ خود ہیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ "میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں اور بی ایس او آزاد کے کارکنوں سے معافی بھی مانگتا ہوں کہ میرا سینٹرل کمیٹی میں چناو کا بنیادی سبب یہی تھا کہ کابینہ کا لابی مضبوط ہو جائے اور انفارمیشن سیکریٹری سمیت کچھ لوگوں کو تنظیم سے فارغ کیا جائے لیکن انہیں نکالنے سے پہلے ہی انفارمیشن سیکریٹری خود ہی نکل گیا بعد میں جس کی وجہ سے کانسٹی ٹیوشنل بلاک بنایا گیا، اس وقت مجھ کو اس بات کا ادراک نہیں ہو سکا کہ غیر شعوری طور پر میں ایک سازش کا حصہ ہوں"۔ میں نے آئینی بلاک کے بارے میں بانک کریمہ کے شیر آیا شیر آیا والے رویے کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں جو لکھا ہے اور ساتھ ساتھ آئینی بلاک کے بیانوں میں مسائل حل کرنے کی کوشش کے جو دعوے کیئے جاتے رہے ہیں ان کی توثیق و تصدیق شادمان بلوچ کے اس بات سے ہوتی ہے کہ "سینٹرل کمیٹی کے ایک اجلاس میں راقم نے یہ رائے پیش کی کہ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کانسٹی ٹیوشنل بلاک ایک الگ تنظیم بنانے کی سازش نہیں ہے اگر ان کارکنوں سے رابطہ کر کے انکے ساتھ بیٹھا جائے اور ان مسائل پر بات چیت کی جائے تو ضرور کوئی حل نکلے گی اور یہ کارکنان واپس تنظیم میں کام کرنے پر راضی ہونگے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس وقت کابینہ کے ارکان کا رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ تھا میرے رائے کو ووٹنگ کیلئے پیش کرنا کجا بلکہ صاف صاف کہا گیا کہ ہم نہ انکے ساتھ بیٹھیں گے اور نہ ہی بات کریں گے انکو جو کرنا ہے کرلیں"۔ اب یہ ثابت ہوتی ہے کہ تنظیم کے نام پر قبضہ کرنے کی خاطر ڈاکٹر اللہ نظر کا یہ مسلط کردہ ٹولہ ایک طویل عرصے سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کا صفایا ایک منصوبے کے تحت کر رہا تھا جہاں تک بات ہے آئینی بلاک بننے کی وجہ سمجھنے کی تو میرے خیال میں شادمان بلوچ کا مندرجہ ذیل جملہ اسے مزید واضح کر دیتا ہے کہ "یہاں بلاتوقف کہوں گا کہ بلاک بننے کی وجہ صرف اور صرف مجھ سمیت مرکز کے رویئے رہے ہیں، آج تنظیم جس بحران کا شکار ہے اسکی ذمہ داری کابینہ کے رویئے اور ہم جیسے سینٹرل کمیٹی کے ارکان کی خاموشی رہی ہے، ہم قصوروار ہیں کہ بات کرنے کے بجائے ہم الٹا ہر جگہ تنظیم کا دفاع کرتے رہے، حتیٰ کے سوشل میڈیا پیج پر ہم لکھتے رہے"۔ زاہد بلوچ کے اغوا کے بعد راقم التحریر نے ایک مضمون کی صورت میں تحریر کیا تھا کہ زاہد بلوچ کے اغواء اور لطیف جوہر کے بھوک ہڑتال کے پیچھے ڈاکٹر اللہ نظر کے وہ گروہی و ذاتی مفادات پوشیدہ ہیں جن میں وہ بی ایس او کو بلی کا بکرا بنا کر لوگوں میں بھیج رہا ہے تا کہ اس وقت پیش کیئے گئے چارٹر اور اس پر ہونے والے تنقید کے اوپر جذبات کا ایک چادر چڑھایا جائے۔ ان تینوں استعفوں میں بار بار لطیف جوہر کے بھوک ہڑتال کا قصہ دہرایا جاتا رہا ہے اور انکے استعفوں کے وجوہات میں سے ایک وجہ رہا ہے، یہ تینوں بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بھوک ہڑتال نا بی ایس او کے مرکزی کمیٹی کے مرضی سے شروع ہوا اور نا ہی انکے مرضی سے ختم ہوا بلکہ اسکے پیچھے کسی اور پوشیدہ شخص کا مرضی تھا۔ عاصم بلوچ نے اس پر تفصیلاً لکھا ہے متن بلوچی میں ہونے کی وجہ سے میں صرف ان میں سے ایک پیراگراف وہ بھی اختصار سے پیش کرنا چاہوں گا تا کہ بات کو سمجھی جا سکے عاصم بلوچ کہتے ہیں کہ "چیئر پرسن ءُ وت یک روچے بنجاھی مجلس ءِ دیوان لوٹا ئینت ءُ گشت کہ بابا مری ءُ واجہ تالپور ءُ ھوار بازیں مرد مانی اپیل اتک انت کہ بھوک ہڑتال ءَ ھلاس بہ کن ات۔ گڑا اے دیوان ءَ اکثریتی ممبراں ھمے گپ کت کہ تا دم مرگ بھوک ہڑتال ھلاس کنگ بہ بیت۔ ءُ دگہ احتجاجی ذریعہ ءِ زورگ بہ بیت۔ بلے جونیئر وائس چیئر مین ءَ اے گُشت کہ اے گپاں ما کابینہ ءِ دیوان ءَ بریں۔ گڑا من ءَ ھوار دگہ سنگتاں ھم ھمے گپ کُت کہ سی سی فیصلہ کت نہ گڑا کابینہ چوں فیصلہ کت کنت۔ بلے گپ گوشدارگ نہ بوت۔ وھدے ھما وھد ءَ ھشتمی سی سی اجلاس ءَ ایشی ءِ سرءَ سوال چست کنگ بوت گڑا گشگ بوت کہ آ Informal دیوانے بوتگ ءُ سی سی ءِ Regular دیوان ءِ فیصلہ ءَ Informal دیوان ھلاس کت نہ کنت۔ حالانکہ اے دیوان ھنگامی دیوانے بوتگ Informal نہ بوتگ۔ دیوان Informal ھما وھد ءَ بیت کہ آئی ءِ کورم پورا مہ بیت۔ ءُ اے دیوان ءُ پیسر ءِ ھنگامی دیوان کہ بوتگ ات دوئینانی نہ ایوک ءَ کورم پورا بوتگ بلکیں گیشتریں ممبر ساڑی ات انت۔ بلے پدا یک روچے انا گتہ سی سی ءِ ممبران ءَ یک بلیک بیری مسیج ءِ ذریعہ ءَ جست کنگ بوت ءُ ہڑتال ھلاس کنگ بوت ءُ ایشی ءِ تہ ءَ ھم بازیں سی سی ممبر اعتماد ءَ زورگ نہ بوت اَنت"۔ اب اسی بات کو شادمان بلوچ کے موقف کے تناظر میں دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "جب لطیف جوہر بلوچ بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے تو مرکزی کمیٹی کے ارکان نے آپسی رابطوں میں اس بات پر زور دیا کہ اس بھوک ہڑتال کو ختم کیا جائے، پھر سینٹرل کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا اور ارکان کی سرزنش کی گئی کے وہ آپس میں کیوں رابطے کر کے ایسی بات کر رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ کیا ارکان آپس میں بھی مسائل پر بات کرنے کے اہل نہیں پھر جب کمیٹی کا میٹنگ ہوا تو مجھ سمیت اکثریت

نے یہ رائے دی کہ بھوک ہڑتال ختم کی جائے لیکن اس اکثریتی رائے کے باوجود وائس چیئرمین نے پورے اجلاس کی سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں میں اتنی جرات نہیں کہ ایک فیصلہ کرکے اس پر ڈٹے رہو وغیرہ وغیرہ اور پھر سینٹرل کمیٹی کے رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ بھوک ہڑتال جاری رہے گی، انتہاء اس وقت ہو گئی جب سینٹرل کمیٹی کے فیصلے کو نظر انداز کرکے بھوک ہڑتال جاری رکھنے کے بعد کچھ دن گذرنے کے بعد کابینہ نے انہی سوشلسٹ جماعتوں کے اپیل پر بھوک ہڑتال سینٹرل کمیٹی کو اعتماد میں لیئے بغیر ختم کردیا اور سینٹرل کمیٹی کے ارکان کو ایک فرضی موبائل میسج بھیج کر رسم پورا کیا گیا، مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ جب بابا خیر بخش مری اور استاد دتا پور نے بھوک ہڑتال ختم کرنے کی اپیل کی تو کابینہ نے کہا کہ ہم تحریری صورت میں انکا اپیل مسترد کریں گے لیکن ان کو مسترد کرنے کے بعد پاکستانی جماعتوں کے فرضی یقین دہانی پر سینٹرل کمیٹی کے ارکان سے منظوری لیئے بغیر کیسے بھوک ہڑتال ختم کیا گیا''۔ان دو موقفوں سے ثابت ہوتی ہے کہ اس بھوک ہڑتال میں نہ بی ایس او آزاد کے اپنے اداروں کا فیصلہ تھا اور نا ختم کرنے میں اب آگے ولید بلوچ کے موقف کو اسی مسئلے پر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھوک ہڑتال عجلت میں ختم نہیں کی گئی بلکہ کسی خفیہ شخص (ڈاکٹر اللہ نظر) کی مرضی ہی اس میں شامل تھی۔ولید بلوچ کہتے ہیں ''بھوک ہڑتال ختم کرنے کا فیصلہ ایک دن پہلے طے پاچکا تھا اور ایک ذمہ دار سیاسی شخصیت کو بھی اس حوالے سے اعتماد میں لیا جاچکا تھا لیکن ہمیں بتایا گیا تھا کہ انہوں نے چند گھنٹوں میں ہنگامی بنیادوں پر یہ فیصلہ لیا ہے اس پر مستزاد یہ کہ مذکورہ سیاسی شخصیت نے کابینہ کے ایک رکن کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ اس اہم فیصلے میں مرکزی کمیٹی کو اعتماد میں لیں مگر اسے یہ کہا گیا کہ سی سی کو اعتماد میں لینے کی کوئی ضرورت نہیں''۔بی ایس او آزاد کی بیان کردہ ان اصل حقائق کو نا صرف عام بلوچوں بلکہ اپنے ہی کارکنوں سے چھپانے کیلئے ہی بانک کریمہ اور باقی ٹولہ ایسے بے بنیاد الزامات پر مبنی بیانات جاری کرتے ہیں، پاکستانی طرز سیاست کی طرح اپنے نااہلیوں اور سیاہ کارناموں کو چھپانے کی غرض سے ایک ''بیرونی سازش'' کا تھیوری گھڑ کر بری الذمہ ہونے کی سعی کی جارہی ہے۔اپنے اس جھوٹ اور حقائق کو پردہ ڈالنے کیلئے وہ مرکزی کمیٹی کو بطورِ ڈھال استعمال کرتے آئیں ہیں، اسی بات کا اعتراف ہمیں ان استعفوں میں ملتا ہے، یہ مضمون اردو میں ہے اسلئے میں عاصم بلوچ کا بلوچی میں دیا گیا استعفیٰ مزید شامل نہیں کروں گا لیکن اس بابت ولید بلوچ کا موقف دیکھنے لائق ہے کہ وہ کیسے کارکنان سے جھوٹ بول کر اپنے گناہوں پر پردہ ڈالتے رہے ہیں ولید بلوچ لکھتے ہیں ''کارکنان کے سامنے ہم ایسے رویوں کا بھی بھرپور دفاع کرتے رہے جن پر ہمیں بذاتِ خود شدید اعتراض تھا تاکہ تنظیم کو مایوسی، انتشار اور بحرانوں سے بچایا جاسکے'' اور اسی احساس گناہ کو شادمان بلوچ یوں بیان کرتے ہیں ''میں اس لیئے استعفیٰ دے رہا ہوں کیونکہ ہم اب کارکن نہیں بلکہ مشین تیار کررہے ہیں'' آگے اسی بات کا ولید بلوچ یوں اعتراف کرتا ہے کہ ''شاید میں بی ایس او آزاد کے بیرونی سازشوں کے خلاف مرکزی کمیٹی میں سب سے سخت موقف رکھنے والا رکن مرکزی کمیٹی رہا ہوں اور اکثر تنظیمی فورمز پر اسکا برملا اظہار بھی کرتا رہا ہوں، مگر یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ جتنی سازشیں بی ایس او کے خلاف بیرونی قوتوں کی جانب سے ہورہی ہے اتنا ہی جواز ہم ان کو اپنے سخت گیر رویوں سے دے رہے ہیں'' ایک بار پھر شادمان بلوچ کے یہ الفاظ دیکھیں "ہم قصوروار ہیں کہ بات کرنے کے بجائے ہم الٹا ہر جگہ تنظیم کا دفاع کرتے رہے، حتیٰ کے سوشل میڈیا پیج پر ہم لکھتے رہے"۔ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ اس وقت بی ایس او آزاد پر مسلط شدہ لیڈرشپ اپنے کارکنوں کے ایک جھوٹ اور سراب کے تحت آگے لیجا رہی ہے۔سوشل میڈیا پر تواتر کے ساتھ یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ بی ایس او آزاد ڈاکٹر اللہ نظر کا پاکٹ آرگنائزیشن ہے، یہ اب قومی نمائندہ جماعت نہیں بلکہ بی ایل ایف کی نمائندہ جماعت ہے لیکن بقول بانک کریمہ یہ باتیں محض اسلم بلوچ، حسن جانان اور سلام صابر کی سازشیں ہیں چلو انہی استعفوں کے روشنی میں دیکھتے ہیں کہ یہ سازشیں ہیں یا بانک کے اپنے وفادار مرکزی ارکان کا بھی یہی رائے ہے۔اسی بابت شادمان بلوچ اپنے استعفیٰ میں مختلف جگہوں پر فرطِ جذبات میں کچھ حقائق کی قلعی یوں کھولتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ آج تک سینٹرل کمیٹی کے جتنے فیصلے ہوئے ہیں وہ ایسے ہوئے ہیں کہ وہ سب فیصلے کابینہ پہلے سے کرکے آتی تھی ان کے پاس سب لکھا ہوا ہوتا تھا، پھر سینٹرل کمیٹی کے سامنے انہیں پیش کیا جاتا تھا اگر سینٹرل کمیٹی انکو منظور کرتی تو کہا جاتا کہ یہ سینٹرل کمیٹی کا فیصلہ ہے اور اگر سینٹرل کمیٹی میں سے کوئی ان پر اعتراض کرکے بات کرتی تو اس کیلئے تنظیم میں عرصہ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔'' ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر تنظیم میں رہنا ہے تو پھر ایک مشین کی طرح صرف احکامات کی تعمیل کرکے رہا جاسکتا ہے اور وہ احکامات از خود مشتبہ ہیں کہ ان کا منبع کہاں ہے، وہ کم از کم سینٹرل کمیٹی نہیں' اب وہ فیصلے کہاں ہوتے ہیں تو حسن جانان اور سلام صابر کو چھوڑیں دیکھیں بی ایس او آزاد کا اپنا مرکزی کمیٹی کا رکن کیا کہتا ہے ''تنظیم کی ساری پالیسیاں مکمل طور پر بی این ایم اور اس سے منسلک مسلح تنظیم کے مطابق بنائی جاتی ہیں، تنظیم کو مکمل طور پر جانبدار بنایا گیا ہے، اور مسلح تنظیموں کے آپسی تضادات کے بیچ ایک فریق بنا کر کھڑا کردیا گیا ہے، بی ایس او آزاد کو ایک مسلح تنظیم کے دفاع کیلئے دوسرے مسلح تنظیم کے سامنے لاکر کھڑا کردیا گیا ہے، حالانکہ ہمیں مکمل غیر جانبدار اور اپنے فیصلوں اور پالیسیوں میں آزاد ہونا چاہیئے تھا ہمارے لیئے تمام تنظیمیں برابر ہونی چاہیئے۔یہ ایک ایسا کھلا راز ہے جسے ہم سب جاننے کے باوجود اس پر بات تک نہیں کرتے کیونکہ جب بات کریں گے تو صرف ایک سادہ سا انکار کرکے اس بات کو ہی دفن کیا جائے گا اور بعد میں اس رکن سینٹرل کمیٹی کو نکالنے کا بندوبست ہوگا''۔اب اگر بی ایس او آزاد کا نام نہاد قیادت پھر بھی فلسفہ انکار پر عمل پیرا رہے تو پھر انکے اور انکے پشت پر آنکھیں بند کیئے ہوئے کارکنان کے عقل پر صرف ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔جب سے یہ تنقیدی سلسلہ چل رہا ہے تب سے کچھ غیر جانبدار اشخاص یہ فرمائش کرتے رہتے ہیں کہ آپ کو پہلے ان مذکورہ تنظیموں کے سامنے اپنا موقف رکھنا چاہیئے تھا پھر بعد ازاں پبلک میں آنا چاہیئے تھا جس پر بار بار عرض کیا جاچکا ہے اور بشیر زیب بلوچ و اسلم بلوچ بھی اپنے تحاریر میں بیان کرچکے ہیں کہ وہ کس طرح

ایک نہیں بلکہ کئی بار ڈاکٹر اللہ نظر اور بابا مری کے پاس جاتے رہے ہیں تا کہ یہ مسائل حل ہوں لیکن ہمیشہ انکی طرف سے منفی جواب ملا ہے اب ہم مجبوراً میڈیا میں آئے ہیں، آج یہ اتحاد اور مسئلوں کو حل کرنے کی بات کرتے ہیں یہ صرف اس خوف سے کہ ان پر عوام کے سامنے تنقید نا ہو ورنہ کچھ عرصے پہلے تک اپنے ہی بیانوں میں یہ سب اختلافات کے وجود تک سے انکاری تھے۔اسی طرح بی ایس او آزاد پر بھی تنقید راتوں رات شروع نہیں ہوئی بلکہ پہلے حتی الامکان یہ مسائل حل کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے لیکن ہمیشہ مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ میں ان استعفوں میں سے یہ جملہ بطور ثبوت یہاں پیش کرنا چاہوں گا کہ ہم فکر دوست ہمیشہ خلوص نیت سے تنقید کرتے رہے ہیں اور سامنے سے نیک نیتی صرف اخباری بیانوں تک محدود ہے تا کہ رائے عامہ کو گمراہ کیا جائے، بی ایس او آزاد کے مرکزی کمیٹی کا یہ رکن خود ہی اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”رابطہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے میں نے شبیر بلوچ اور اسلم بلوچ سے بی ایس او آزاد کا نمائندہ بن کر گفتگو کی ان کے رویے دیکھ کر میری حوصلہ افزائی ہوئی کیونکہ وہ ان مسائل پر بیٹھنے اور ان پر بات کرنے پر راضی تھے اور کسی حل کی جانب بھی جانا چاہتے تھے، انکا اعتراض یہ تھا کہ بی ایس او آزاد خود جانبدار بن کر ایک فریق کی شکل اختیار کر چکا ہے، لیکن مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں تمام ارکان کے سامنے جب یہی بات میں نے کی تو آپ کے رویئے انتہائی مایوس کن تھے، چیئرپرسن نے بذاتِ خود کہا کہ ہم نہ ان سے بیٹھ کر بات کریں گے اور نا ہی رابطہ رکھیں گے“۔اسی بات کو شادمان بلوچ اپنے استعفے میں بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ ”میں حیران تھا کہ میڈیا کے سامنے ہم ان مسائل کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان مسائل کے حل کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہم خود ہیں“۔اور مزید بی ایس او آزاد کے باجگزار قیادت کے نیتوں کی اصلیت ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ ”کابینہ نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ کوئی تنظیم میں رہے یا نا رہے بس تنظیم کا نام انکے قبضے میں رہے، صرف اس نام کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کی خاطر اس وقت بلوچ سیاست کو جس حد تک ہم سے نقصان مل رہا ہے یہ خود ہمارے لیئے باعثِ شرم ہے“۔اب بی ایس او کے نام نہاد اور من گھڑت ثالثی کے دعووں کی کیا حیثیت رہتی ہے آپ خود اندازہ لگالیں۔اسی طرح بی ایس او کی یہ منافقت صرف یہاں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ میڈیا میں جس طرح خود کو پاک صاف ظاہر کر کے معصوم بن کر کہا جاتا ہے کہ ہم پر تنقید ہو رہی ہے، سوشل میڈیا پر گالم گلوچ ہوتی ہے ہم تو کچھ نہیں کر رہے اصل میں سوشل میڈیا پر بدتمیزی کا جو طوفان نظر آتا ہے اسکے پیچھے یہ خود شامل ہیں تا کہ حقیقی تنقیدی سلسلے کو پراگندہ کیا جائے، ثبوتاً بی ایس او آزاد کے کسی سینٹرل کمیٹی کے کاروائی کی روائیداد شادمان بلوچ کے زبانی سنیں ”سینٹرل کمیٹی کے اجلاس میں ثبوت کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ سیکریٹری جنرل پابندی کے باوجود سوشل میڈیا میں مختلف ناموں اور پیجوں سے لکھ رہا ہے، ایک ہتک آمیز پیج سے انوائٹ کرنے کا اسکا ثبوت بھی موجود تھا، سیکریٹری جنرل نے ایک بار مجھ سے ذاتی طور پر بھی کہا تھا کہ وہ فیس بک آئی ڈی دیدگ رحمان ہے پھر کہا نہیں دیدگ رحمان اسکا دوست ہے، حتیٰ کے مجھے تک کہا کہ کوئی آئی ڈی بنا کر کسی کو بتائے بغیر سلام صابر وغیرہ کے خلاف لکھنا شروع کرو“۔اب اس پر میں ضروری نہیں سمجھتا کہ مزید روشنی ڈالوں۔ بیان کردہ یہ استعفے تین مہینے پہلے اکتوبر کے مہینے میں دیئے گئے ہیں، اس سے پہلے یہی لوگ دیدہ دلیری سے بی ایس او آزاد کا دفاع کرتے رہے ہیں لیکن جھوٹ، دھوکے اور منافقت کی ایک حد ہوتی ہے جس پر بالآخر حق و سچ فتح پاتی ہے۔آج بی ایس او آزاد کو یرغمال بنا کر بلوچ طلباء سیاست میں ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ جس طرح زہر گھول رہا ہے اسے تاریخ ہمیشہ سیاہ الفاظوں میں یاد کرے گی تحریر کے طوالت اور بی ایس او کے کئی مرکزی ارکان کے سیکیورٹی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے میں نے بہت سی اہم باتیں اس مضمون میں شامل نہیں کیئے ہیں، باقی کوشش کی انکا موقف من وعن پیش کرسکوں اسکے علاوہ اور بہت سارے ایسے شرم انگیز حقائق سامنے آئیں ہیں جن کو فلحال میں میڈیا میں لانا مناسب خیال نہیں کررہا لیکن اگر جھوٹ اور گمراہی کا بازار اسی طرح گرم رہا تو پھر بی ایس او آزاد میں موجود مخلص بلوچ طلباء کے جان سے بڑھ کر کوئی اور راز اہم نہیں ہوگا۔ میں مضمون کا اختتام شادمان بلوچ اور ولید بلوچ کے ان دو جملوں سے کروں گا تا کہ آپ کو بھی اندازہ ہو کہ لوگ مایوس تنقید سے نہیں بلکہ اس غلیظ سیاست سے ہو رہے ہیں ولید بلوچ کہتا ہے ”ان رویوں کے تدارک کی کوششوں میں ناکامی اور حد درجہ مایوسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنظیم میں میری موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتا“ اسی طرح شادمان بلوچ کا سوچ ہے کہ ”ان تمام مسائل کو اپنی آنکھوں کے سامنے روز دیکھ کر اور بہتری لانے کیلئے خود کو بے بس پا کر میں اپنے پاس کوئی بھی اخلاقی جواز نہیں پاتا ہوں کے میں مزید سینٹرل کمیٹی کے عہدے پر براجمان رہوں، اگر کابینہ سمیت تمام ارکان کمیٹی اپنے لیئے کوئی اخلاقی جواز دیکھتے ہیں تو پھر امید کروں گا کہ وہ تنظیم کو بہتر کریں گے“۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ ے

ہم وہ قوم ہیں جہاں ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ توہین آمیز خاکے جاری کرنے والے میگزین چارلی ہیبڈو کے ”آزادی اظہارِ توہین“ کے حق میں ٹویٹ کر کے اس پر حملوں کی مذمت کرتا ہے لیکن خود پر تنقید کرنے والوں کی سروں کو عمران فاروق کی طرح اینٹوں سے کچلنے کا اسکا دل کرتا ہے

انسان دراصل ایک مخصوص شعور کا نام ہے، یہ شعور انفرادی سطح پر ایک ''زندہ وجود'' سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور زندہ وجود کو ایک ایسی کائنات میں زندہ رہنا ہوتا ہے جو کسی ضابطہ حیات کی پابند نہیں ہے۔ آفاقی اصول موجود ہیں مگر ہر ذی نفس کو ذاتی سطح پر مکمل بے یقینی کی فضا میں سانس لینا ہوتا ہے۔ فرد کے لئے افق لاقانونیت پھیلی ہے۔

ہمگام ادب

دیوار

ــــــ جین پال سارتر

آخر کار انہوں نے ہمیں ایک بڑے کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز کے پیچھے چار آدمی سر جھکائے کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے۔

کمرے کے کونے میں بہت سے گرفتار شدگان سر جھکائے کھڑے تھے۔ پہلی قطار میں دو بھورے بالوں والے غیر ملکی قیدی تھے۔ ان کی شکلوں میں خاصی مماثلت تھی۔ غالباً دونوں فرانسیسی تھے۔ چھوٹی عمر والا غیر ملکی، خوف دور کرنے کے لیے بار بار اپنی پتلون کھینچ کر اوپر کر رہا تھا۔

کاروائی مکمل ہونے میں تقریباً تین گھنٹے صرف ہوئے۔ تھکن کے باعث میرا بدن نڈھال اور دماغ سوچنے سے عاری ہو چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک سردی کی شدت سے کانپنے کے بعد اب اس کمرے کی حرارت مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

سپاہی ایک ایک کر کے قیدیوں کو سامنے لے جا رہے تھے، جہاں ان سے کم و بیش یکساں باتیں پوچھی جا رہی تھیں۔

''پورا نام کیا ہے؟''

''کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے؟''

عام طور پر یہی دو سوال کئے جاتے۔ کبھی کبھی ان سوالات سے تجاوز کیا جاتا۔

''اسلحے کی تباہی میں تم بھی شریک تھے؟''

''نو تاریخ کی صبح تم کہاں تھے؟''

وہ جواب سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ سوال کرنے کے بعد وہ سامنے کھڑے قیدی کو غور سے دیکھتے اور پھر سر جھکا کر کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔

''تم انٹرنیشنل بریگیڈ کے لیے کام کرتے رہے ہو؟'' انہوں نے ٹام سے پوچھا، اور جواب سنے بغیر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

جون سے انہوں نے صرف اس کے نام کی تصدیق چاہی اور پھر دیر تک کاغذوں پر کچھ تحریر کرتے رہے۔

''میرا بھائی ان کے لیے کام کرتا رہا۔ میں نے کچھ نہیں کیا میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں''۔ جون بولتا رہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں بتا رہا ہوں...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کے اعمال کا میں ذمہ دار نہیں ہوں''۔ جون کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک گارڈ اسے کھینچتا ہوا لے گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں''، میں نے جواب دیا۔

''ریمون کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم''

''چھ سے انیس تک تم نے اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا''۔

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے''

وہ سر جھکائے قلم چلانے لگا اور ایک گارڈ مجھے دھکیلنے لگا۔

بڑے کمرے میں ٹام اور جون دو گارڈز کے درمیان میرا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ ابتدائی کاروائی تھی یا مقدمہ ختم ہو گیا؟؟'' ٹام نے گارڈز سے پوچھا۔

''یہ مقدمہ تھا''۔ ایک گارڈ نے جواب دیا۔

''تو اب.....اب کیا ہوگا؟''

''تمہاری کوٹھڑی میں بے پناہ ٹھنڈ تھی۔ ہم نے ساری رات کانپتے ہوئے گزاری صبح کے وقت بھی درجہ حرارت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جون خاموش بیٹھا رہا۔ کم سنی اور نا تجربہ کاری کے باعث وہ خوف سے گنگ ہو گیا تھا۔ البتہ ٹام اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔

کوٹھڑی میں ایک بینچ اور چار کمبل پڑے تھے۔ عدالت سے آ کر ہم الگ الگ کمبلوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''غالباً ہم ٹھکانے لگ گئے''۔ ٹام نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر چھوٹا بلاوجہ ڈر رہا ہے۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے''۔

''کسے؟ جون کو؟ ہاں' یہ جوزے کا چھوٹا بھائی ہے۔ جوزے نے ان کے خلاف جان کی بازی لگا دی ہے''

میں نے جون کی سمت دیکھا۔ وہ بدستور سکتے کی عالم دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

کوٹھڑی کے جن سوراخوں سے صبح کی روشنی اندر آئی' اچانک انہی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے داخل ہو کر ہلچل مچا دی۔ جون سردی سے کانپنے لگا۔

''خدا کی پناہ!'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔ ''میں تو سزا پانے سے پہلے سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا''۔

ٹام نے خود کو گرم کے لیے ورزش شروع کر دی۔ ٹام مضبوط جسم کا مالک تھا مگر عمر ڈھلنے کے ساتھ اس کے بدن پر موٹاپے کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اسے ورزش کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کل کسی وقت اس کے فربہ وجود میں گولیاں اور سنگینیں یوں اتریں گی جیسے مکھن کی ٹکیہ میں چھری اُترتی ہے۔

شدید سردی کے باعث مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے بازو میرے وجود سے الگ ہو گئے ہوں۔ ایسے لمحوں میں مجھے اپنا جیکٹ یاد آتا۔ جو انہوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے سارے کپڑے اتروا کر سپاہیوں کو پہنا دیے تھے، اور ہمیں اس موتی پاجامے کرتے میں ملبوس کر دیا تھا۔ جو ہسپتال کے مریضوں کا گرمیوں کا لباس ہوتا ہے

تھوڑی دیر ورزش کے بعد' ٹام سانس درست کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔

''کچھ گرمی آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں'' اس نے برا منہ بنا کر کہا''۔ مگر سانس پھول گیا''۔

آٹھ بجے کے قریب ایک فوجی افسر تین سپاہیوں کے ساتھ ہماری کوٹھڑی میں آیا۔

''ان تین کے نام کیا ہیں؟'' افسر نے ہمارے گارڈ سے سوال کیا۔

''ٹام، جون اور پابلو'' گارڈ نے جواب دیا۔

افسر نے عینک درست کی' اور ہاتھوں میں تامی فہرست کو غور سے دیکھا۔

''ٹام.........ٹام.......یہ ہے۔ ٹام' تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی مار دی جائے گی''۔

یہ کہہ کر وہ پھر فہرست پر جھک گیا۔

''اور........تم دونوں کو بھی۔ جون اور پابلو۔ سزائے موت'' اس نے فہرست پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ ناممکن ہے'' جون چیخ پڑا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''جون مربل''۔

''یہ......یہاں تمہارا نام ہے''۔افسر نے اطمینان سے تصدیق کی۔

''..........اور تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے''

''لیکن میں نے کلچھ نہیں کیا''۔جون کی آواز میں وحشت تھی۔

افسر نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ہم دونوں کی جانب رُخ کر کے بولا''کچھ دیر میں تم لوگوں کے پاس ایک ڈاکٹر آئے گا گ،اسے رات بھر تمہیارے پاس رہنے کی اجازات ہے''۔

یہ کہہ کر افسر فوجی انداز میں ایڑھوں پر گھوم کے چلا گیا،

''میں نے کیا کہا تھا''۔ٹام فوراً بولا''ہم ٹھکانے لگ گئے ہیں''۔

''ہاں''میں نے کہا۔مگر چھوٹے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے''۔

میں نے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے چھوٹے پر غصہ آرہا تھا۔اس کا چہرہ خوف کی زیادتی سے ٹیڑھا ہو گیا تھا،اور نقوش عجیب انداز میں مسخ ہو گئے تھے۔اس کی یہ حالت مجھے بے چین کر رہی تھی۔جس کے باعث مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔تین دن پہلے تک یہ محض ایک بچہ تھا لیکن ان وہ کسی دوسرے سیارے سیارے کی بوڑھی مخلوق لگ رہا تھا۔مجھے یقین تھا کہ اب اگر رہائی مل بھی گئی تو وہ دوبارہ کبھی بچہ نہیں لگے گا،ممکن ہے وہ ہمدردی کا مستحق ہو لیکن مجھے ہمدردی جرتے ہوئے متلاہٹ ہوتی ہے،سزا سننے کے بعد وی خاموشی سے زرد ہوتا جارہا تھا۔اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ٹام نے رحم کے جزبے سے مغلوب ہو کر اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا مگر اس نے خود کو نہایت شدت سے کونے میں سمیٹ کیا اور چہرہ بگاڑ کر ٹام کو گھورا۔

''اسے چھوڑ دو ٹام''۔میں نے آہستگی سے کہا۔''یہ دھاڑیں مارنے والا ہے''۔

ٹام چاہتا تھا کہ چھوڑے کو تسلی دے'اس سے ہمدردی کرے،وہ چاہتا تھا کہ اس عمل میں مصروف رہنے کے باعث ضرو اس کا دل بھی بہلا رہے گا،اور اپنے بارے میں سوچنے سے بچائے گا۔مجھے ٹام کی حرلت بری لگ رہی تھی۔میں نے بھی پہلے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

پہلے کبھی موت واضح طور پر میرے سامنے آئی ہی نہیں تھی،مگر اب جبکہ موت سامنے تھی۔میں اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا،میں اپنے جسم میں داخل ہوتی گولیوں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا،مرنے سے پہلے چیخ مارنے کی فرصت ملتی ہو گی یا نہیں؟تمام گولیاں جس پار کرتی ہوئی دوسری سمت نکل جاتی ہیں یا........؟مجھے جلدی نہیں تھی ان باتوں پر غور کرنے کے لیے میرے پاس تمام رات پڑی تھی۔

کچھ دیر بعد ٹام بھی خاموش ہو گیا۔میں نے کنکھیوں سے اُسے دیکھا،وہ پیلا پڑ رہا تھا،میں نے سر اُٹھایا اور چھت کے سوراخ سے ایک ایک ستارہ چمکتے دیکھا،سرد اور شفاف رات کی ابتداء ہو چکی تھی۔

دروازہ کھلا اور دو گارڈز داخل ہوئے ان کے ساتھ بھورے بالوں والا ایک وردی پوش شخص تھا۔

''میں ڈاکٹر ہوں''اس نے خوش دلی سے کہا۔''جہاں تک ممکن ہوا'میں اس دردناک صورت حال میں آپ کی مدد کروں گا''۔

''تم کیا کرو گے؟''میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''جو تم کہو گے۔تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے وش گوار بنانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں''۔ڈاکٹر کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''تم ہمارے ہی پاس کیوں آئے؟اور بہت سے ہیں قید خانہ بھرا ہوا ہے''۔

س''مجھے یہاں بھیجا گیا میں یُاں آ گیا''۔اس کی آواز دھندلا گئی،پھر وہ فوراِ سنبھل گیا،''تم سگریٹ پیتے ہو؟میرے پاس سگریٹ نہیں سگار بھی ہیں''۔

''نہیں۔شکریہ''،میں نے سگریٹ لینے سے انکار کر دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا اور پھر یکا یک اس کی موجودگی سے لاتعلق ہو گیا۔دونوں گارڈز فرش پر بچھے ایک کمبل پر بیٹھ گئے۔طویل القامت گارڈ جس کا نام پیڈرو تھا اپنی انگلیاں چٹخار ہا تھا جب کہ دوسرا گارڈ نیند کے غلبے جسے نجات حاصل ؛کرنے کے لیے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔

میں نے پشت سیدھی کی اور اپنے دونوں ساتھیوں پر بظر دورائی،ٹام اپنا سر گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔جون قابل رحم حالت میں تھا اس لکا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھول رہے تھے۔

ڈاکٹر نے جون کی کلائی تھام کر اس کی نبض کی رفتار معلوم کرنی چاہی۔ جون نے خاموشی سے اپنا بازو ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیا اور بدستور کھلے منہ کے ساتھ نتھنے پھلاتا رہا۔
معلوم نہیں کیوں میں ڈاکٹر کی اس حرکت پر جھنجلا گیا۔ ''کتے کا بچہ'' میں نے خود کو بڑبڑاتے سنا۔
''میرے پاس آیا تو حرامی کا جبڑا توڑ دوں گا''
وہ میرے پاس تو نہیں آیا۔ مگر چھوٹے سے فارغ ہو کر بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ میں حیران ہوا کہ وہ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے۔
''بہت ٹھنڈ پڑ رہی ہے، کیا خیال ہے؟ اس نے عجیب انداز میں مجھ سے پوچھا۔
''مجھے تو محسوس نہیں ہو رہی''۔ میں جواب دیا۔ لیکن وہ حسب سابق مجھے غور سے دیکھتا رہا۔
اچانک مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں س ءاپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔
میرا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ یہ عجیب انکشاف تھا۔ اس قدر سردی میں میرا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے سر کے بال گیلے ہو کر اکڑ گئے تھے۔ کپڑے جسم سے چپک گئے تھے۔ میں تقریباً ایک گھنٹے سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی اس حالت سے بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے دیکھے تھے۔ اور سمجھ گیا تا کہمیں خوف کی شدت سے پگھل رہا ہوں۔ وہ خاموشی سے میری اس حالت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ ڈاکٹر کا چہرہ نوچ لوں۔ میں اس ارادے سے کھڑا ہوا، مگر اچانک مجھے میرا غصہ بے جا معلوم ہوا، اور میں نے خود کا لاتعلقی کی کیفیت طاری ہوتے محسوس کیا۔ میں نے کندھے اچکائے اور بینچ پر بیٹھ گیا۔
بینچ پر بیٹھ کر میں اپنے جسم کا پسینہ پونچھنے لگا۔ جلد ہی میرا رومال لبریز ہو گیا، مگر میرے بدن سے پسینہ بدستور نمودار ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے پسینہ خشک کرنے کی کوشش ترک کر دی اور خود سے ایڑی سے چھوٹی تک بیگھتے محسوس کرنے لگا۔
''تم داکٹر ہو۔ ہیں؟ یکلخت جون نے سوال کیا۔
''ہاں'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔
''بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے۔ ہیں؟
''کب؟ اوہ۔ اس وقت۔ نہیں'' ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا۔
''سب کچھ جلدی ہو جاتا ہے''۔
''لیکن میں........ کچھ لوگوں نے بتایا کہ کبھی کبھی...... کبھی کبھی دوسری مرتبہ بھی فائر کرنا پڑتا ہے''۔
''کبھی کبھی، ہاں پہلی مرتبہ چلائی جانے والی گولیاں اہم اعضاء کو چھوئے بغیر پار ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں۔ کبھی کبھی۔ ہاں''
''تو پھر وہ اپنی بندوقوں میں دوبارہ گولیاں بھرتے ہوں گے؟''
''ہاں''
''مگر اس وقت لگتا ہے'' چھوٹے کی آواز میں لرزش تھی۔ چھوٹا جسمانی اذیت کے خیال سے خوف زدہ تھا یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ مجھے ایسی کوئی تشویش نہیں تھی۔ پسینہ آنے کی کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔
میں نے ٹام کی جانب نظریں دوڑائیں اور یہ کچھ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بھی پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ اس منظر سے بچنے کے لیے میں سر اُٹھایا تو چھت کے سوراخ سے آسمان نظر آیا۔ کہکشاں اسی ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن آج ستارے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ صبح کے وقت آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر مجھے بحرِ اوقیاس کے روشن اور خوبصورت ساحلوں کا خیال آتا تھا۔ دوپہر کے وقت مجھے دور افتادہ جزیرے کا وہ چھوٹا سا مے خانہ یاد آتا جہاں منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لیے شراب کے ساتھ زیتون کا اچار پیش کیا جاتا تھا شام کے وقت جب سائے دراز ہوتے تو میں کھیل کے اس میدان کے بارے میں سوچتا جس کے نصف حصے میں چھاؤں پھیل جاتی تھی۔ اور نصف حصہ روشن رہتا تھا۔ اور جب مجھے خیال اا تا کہ زمین بھی یوں ہی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی آسمان کی وسعت میں گھوم رہی ہے تو میرے سینے میں درد کی ایک لہر اُٹھتی تھی۔ مگر اس کوٹھڑی سے آسمان دیکھنے پر مجھے ماضی کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ میں نے آسمان سے نظریں ہٹا کر ایک گہرا سانس لیا۔ اور ٹام کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔
بالآخر ٹام نے بولنا شروع کیا۔ خیالات کی یلغار سے بچنے کے لیے وہ گفتگو کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ میری جانب دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ میرا رنگ زرد ہو گیا تھا اور میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ٹام کا بھی یہی حال تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن گئے تھے یہ ہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف دیکھے بی ء ر باتیں کر رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر فکے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت کوٹھڑی میں فقط ڈاکٹر ایک زندہ شخص ہے۔

''تمہاری سمجھ میں آرہا ہے؟ میں تو کچھ پا رہا'' ٹام نے طویل گفتگو کے اختتام پر کہا۔

''کیا سمجھنا چاہ رہے ہو''

''ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہا''۔

''فکر مت کرو، سب سمجھ میں آجائے گا'' میں نے کہا۔

اچانک مجھے ٹام کے پاس سے عجیب سی مہک آتی محسوس ہوئی۔ عام حالات میں میری ناک اتنی حساس نہیں تھی۔ میں نے نتھنے پھلا کر حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا''۔ ٹام مسلسل بول رہا تھا''۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن کچھ تو پتہ چلے۔ دیکھو میں جانتا ہوں وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے .... ٹھیک ہے؟؟ تمہارا کیا خیال ہے کتنے لوگ ہوں گے؟''

''کیا؟ ہاں لوگ!! معلوم نہیں پانچ i...... یا آٹھ۔ اسے زیادہ تو نہیں ہوں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ فرض کیا کہ وہ آٹھ ہوں گے۔ کوئی چیخ کر انہیں نشانہ باندھنے کا حکم دے گا۔ ٹھیک ہے۔ فوراً مجھ پر آٹھ بندوقیں تن جائیں گی۔ میں دیوار کے دوسرے طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ پوری قوت لگا دوں گا، لیکن دہیوار ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں ہوتا ہے .... میں جانتا ہوں ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ مگر سمجھ میں نہیں آرہا''۔

''مت سوچو''۔ میں نے کہا سب جانتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا''۔

''بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ سنا ہے چہرہ بگاڑنے کے لیے خاصطور پر آنکھوں اور منہ کا نشان لیتے ہیں۔ کتے'' ٹام کے لیے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔'' مجھے تو ابھی سے اپنے بدن میں سوراخ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں .... ایک گھنٹہ ہوگیا چہرے اور گردن میں درد ہو رہا ہے۔ اصل میں تو یہ درد کل محسوس ہوگا۔ اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہیں؟''

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ مگر میرے انجان بنے رہنا بہتر تھا۔ جہاں تک درد کا تعلق تھا میں خود اپنے بدن میں سوراخ ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ اس لحاظ سے میں بھی اس جیسا تھا۔

ٹام دوبارہ بولنا شروع ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بدستور ڈاکٹر پر گڑی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر ہر چیز سے لاتعلق تھا۔ میں ڈالٹر کے آنے لامقصد جانتا تھا۔ وہ ہماری باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ وہ ہمارے جسموں کی نگہداشت پر مامور تھا۔ ہمارے جسم جو زندگی میں ہی مر رہے تھے۔

''بالکل جس طرح بھیانک خوابوں میں ہوتا ہے''۔ ٹام نولے چلے جا رہا تھا۔'' ٹھوس چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ دھوئیں کی طرح۔ یا جیسے ہوا یا بادل یا کوئی بھی چیز۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔

گولیاں سوراخ اور درد۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں خود اپنی لاش دیکھنے لگتا ہوں۔ عام بات نہیں ہے۔ خود اپنی لاش، اپنی آنکھوں سے۔ اپنی لاش کون دیکھنا چاہتا ہے؟ میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ آنکھیں بند کرلوں؟ میں تو کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ دنیا دوسروں کے قائم رہے، مجھے کیا ہے۔ میں نے دو راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ حد ہوتی ہے آدمی بکھر جاتا ہے۔ پابلو یقین کرو۔ میں کسی چیز کا انتظار کر رہا ہوں، مگر یہ وہ چیز نہیں ہے۔

''وہ چیز تو ہمیں پیچھے سے پکڑ لے گی۔ بے خبری میں ۔۔۔۔

''بکواس بند کرو۔ میں نے چیخ کر کہا۔'' پادری کو بلاؤں؟ وہی تمہاری سنے گا''۔

مجھے ٹام کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اب اگر ہمیں ساتھ مرنا پڑ رہا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگوں۔ اس وقت ریمون میرے ساتھ ہوتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ریمون میرا دوست تھا۔ ٹام اور جون کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

ٹام اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ میں اس کا مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے مسلسل بول رہا تھا۔ اس طرح مرنا غیر فطری تھا۔ اور غیر فطری موت کے اس قدر نزدیک پہنچ کر مجھے ہر چیز غیر فطری لگ رہی تھی۔ بجھے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر، بینچ، ڈاکٹر کا چہرہ۔ سب کچھ غیر فطری تھا۔ ٹام کے اور میرے احساسات ایک جیسے تھے مگر میں اس کی طرح کا رویہ نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ ہم تمام رات ایک طرح کی باتیں سوچتے رہیں گے۔ ہمارے دھیان میں ایک جیسی چیزیں آئیں گی۔ ہم دونوں زرد پڑتے رہیں گے۔ لرزیں گے اور پسینے نہا جائیں گے میں نے کنکھیوں سے ٹام کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سایہ تھا۔ میری انا کو دھچکا لگا۔ ہم چوبیں گھنٹے سے ساتھ تھے۔ میں نے

اس سے باتیں کی تھیں، اس کی گفتگو سنی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے اس کے باوجود اب ہم جڑواں بھائیوں کی طرح ایک جیسے نظر آ رہے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں ساتھ مرنا تھا۔

ٹام نے میری جانب دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔

''قابلو۔ حیرت ہوتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہم مرتے ہیں تو ختم ہو جاتے ہیں۔ بالکل ختم۔ ہمیشہ کے لئے''

میں نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''نیچے دیکھو۔ غلیظ آدمی''

ٹام گیلے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی پتلون سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''کیا! یہ کیا ہے؟؟'' اس نے اپنے نیچے دیکھ کر خوف اور حیرت سے کہا۔

''تم اپنی پتلون گیلی کر رہے ہو'' میں نے اسے بتایا۔

''ناممکن ہے''۔ وہ غرایا'' یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں تو کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا''

میں نے ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ وہ لاتعلقی سے گیلے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ ''اس کی گرفت کمزور ہو گئی ہے''۔

چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ رائے دی۔

''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے''۔ ٹام نے سختی سے کہا۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ خدا کی قسم خوفزدہ نہیں ہوں''

ڈاکٹر کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا کر اپنی نوٹ بک میں تحریر کرنے لگا۔

میں اور ٹام ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ جون بھی ڈاکٹر دیکھ رہا تھا۔ ہم تینوں کی نظریں ڈاکٹر پر گڑی تھیں، کیونکہ ڈاکٹر زندہ تھا۔ فقط وہ زندہ آدمیوں کی طرح مصروف تھا۔ اس کا تجسس زندگی کی نشانی تھا۔ ڈاکٹر کو سردی لگ رہی تھی۔ اس کا بدن زندہ آدمیوں کی طرح موسم سے متاثر ہو رہا تھا۔ جبکہ ہمیں اپنے جسموں کو محسوس کرنے کے لئے خود کو چھونا پڑ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید اب میں بھی گیلے فرش پر بیٹھا ہوں مگر شرمساری سے بچنے کے لئے میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں ہم سوائے ڈاکٹر کو دیکھنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر اپنی ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ اسے اپنے جسمانی اعمال پر کنٹرول تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ کل شام اور پرسوں صبح کو اس کی مصروفیات کیا ہوں گی۔ ڈاکٹر زندہ تھا اور ہم تین سائے اسے دیکھ رہے تھے اس کے جسم سے حرارت اور خون چوس کر دوبارہ زندہ ہونا چاہتے تھے۔ اچانک میں بلند آواز سے ہنسنے لگا۔ میرے قہقہے نے ایک گارڈ کو چوکنا کر دیا۔ دوسرا بدستور کھلی آنکھوں کے ساتھ سویا رہا۔ سوئے گارڈ کی آنکھوں کا سفید حصہ نظر آ رہا تھا اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

میں بیک وقت تھکن اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ صبح کیا ہوگا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لئے میں بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ لیکن جوں ہی میری توجہ کسی اور چیز پر مرکوز ہوتی، مجھے بندوق کی نالیاں دکھائی دیتیں جو دھیرے دھیرے میرے چہرے کی سمت اٹھنے لگتیں۔ متعدد مرتبہ گولیاں میرے وجود کو چیرتی چلی گئیں۔ ایک بار تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں واقعی ٹکڑے ہو گیا ہوں۔ میں اونگھ گیا تھا۔ وہ مجھے دیوار کی سمت کھینچ رہے تھے۔ میں پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ نڈھال ہونے پر میں ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گولیوں سے چھلنی ہوتے ہی میں نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا مجھے ڈر تھا کہ شاید ڈاکٹر نے مجھے چیختے ہوئے سن لیا ہے۔ مگر ڈاکٹر ایک کونے میں بیٹھا لاتعلقی سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ اور اب میری آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ اگر میں چاہتا تو اس لمحے گہری نیند ن سو سکتا تھا مگر میں اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹے سو کر نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے لینے آئیں گے۔ اور میں غنودگی کے عالم میں سر جھکائے ان کے ساتھ چل دوں گا۔ شاید میں ان سے یہ پوچھ سکوں کہ مجھے جانوروں کی طرح کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ میں مرنے سے پہلے سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے نیند کے دوران ڈراؤنے خوابوں کا بھی اندیشہ تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لئے میں ماضی کے خوش گوار لمحے دھیان میں لایا۔ کتنے دل کش چہرے تھے۔ کیسی دلچسپ باتیں تھیں۔ چھٹیاں، تہوار اور میلے اور جھولے، چھوٹے ماموں اور ریمون۔ شاید ریمون کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ کیسا عجیب دن تھا۔ جب میں نے احتجاجی جلوس میں شرکت کی تھی۔ اور غرناطہ کی وہ رات جو میں نے ایک بینچ پر جاگ کر گزاری تھی۔ اس کے باوجود صبح کے وقت میں اسے مسکرا کر ملا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور آزادی کی زندگی اور خوبصورت عورتیں۔ میں نے دیوانہ وار ان کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں آزادی کی تحریک کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ نعرے لگاتا رہا تھا تقریریں کرتا پھرا تھا۔۔۔۔ اور اس دوران موت کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اب جبکہ زندگی ختم ہو رہی تھی ان ساری چیزوں کا کیا مطلب تھا؟ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ میں لڑکیوں کی صحبت میں اس قدر خوش تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں اس طرح مروں گا۔ تو میں تمام زندگی اپنے بستر سے اٹھنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میری پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اب سب کچھ اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ مجھے کسی بات کا زیادہ دکھ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں مجھے کچھ چیزیں چھوڑنے کا افسوس ہوتا۔ اپنے پسندیدہ کھانوں کا ذائقہ یاد آتا۔ یا میں اس پرسکون جھیل کے تصورت سے افسردہ ہوتا جہاں میں گرمیوں کی دوپہر میں تیرا کرتا تھا۔ لیکن موت نے تمام چیزوں کی دلکشی چھین لی تھی۔

''دوستو!'' اچانک ڈاکٹر نے ہمیں مخاطب کیا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارا آخری پیغام تمہارے پیاروں تک پہچا دوں گا''۔

''میرا کوئی نہیں ہے۔'' ٹام ناگواری سے بولا۔

میں خاموش رہا۔

ٹام میری خاموشی پر حیران ہوا۔

''کانشہ! تم ''کانشہ'' کے نام کوئی پیغام نہیں بھجواؤں گے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں''۔ میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

آج میرے لئے کانشہ کی اہمیت مختلف تھی۔ کل تک میں اس سے پانچ منٹ بات کرنے کے لئے اپنا ایک بازو کٹوانے پر رضامند ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے کل ٹام سے کانشہ کا ذکر کر دیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کانشہ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بات کرنا تو در کنار اب میں کانشہ کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جب سے میرا بدن پیلا پڑا تھا، اور میں پسینے میں نہا گیا تھا، مجھے اپنے بدن سے کراہت آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کانشہ کے بدن کی یاد سے بھی متلاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب اسے میری موت کی طلاع ملے گی تو وہ روئے گی زندگی میں اس کی دلچسپ ختم ہو جائینگے۔ کئی دنوں تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ مگر بہر حال وہ زندہ رہے گی۔ جبکہ میں مر رہا تھا۔ مجھے اس کی خوبصورت آنکھیں یاد آئیں۔ جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی نہایت لطیف چیز اس کے وجود سے نکل کر مجھ میں داخل ہو رہی ہے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس لمحے وہ مجھے دیکھے گی تو مجھ پر اس کی نظروں کا قطعی کوئی اثر نہیں ہوگا۔۔۔ اس مرحلے پر میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا۔ گو اس کی تنہائی کا انداز مختلف تھا۔

اس وقت وہ بینچ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بازو بڑھا کر لکڑی کو چھوا۔ اور پھر فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ایسا تاثر ابھرا جیسے اس نے نادانستگی میں کوئی چیز توڑ دی ہو۔ وہ دوبارہ کانپنے لگا مجھے ٹام کی حالت پر حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے خود یہ احساس ہو رہا تھا کہ چیزیں مضحکہ خیز انداز میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ دیواروں کا رنگ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ بینچ کی لکڑی، لالٹین یا کوئلوں کی راکھ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم مرنے والے ہیں تمام چیزیں ایک فاصلے پر کھڑی سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بسترِ مرگ پر پڑے مریض کے تیماردار کمرے کے ایک کونے میں دائرہ وار کھڑے دبے لہجے میں اس کی موت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں۔

میں اس حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اب اگر بتایا جاتا کہ مجھے آزاد کر دیا گیا ہے تو میں اپنی جگہ منجمد ہو جاتا۔ ایک مرتبہ اپنے فانی ہونے کا احساس ہو جائے۔ تو موت میں چند گھنٹے یا چند برسوں کی تاخیر ایک ہی بات لگتی ہے۔ ایک لحاظ سے میں بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن خوفناک بات یہ تھی کہ میرا بدن میری مرضی کے بغیر کانپ رہا تھا اور میرے کپڑے پسینے میں یوں تر بتر تھے جیسے میرا وجود اندر ہی اندر پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ میں نے خود کو چھوا، ہاتھ سے محسوس کیا یوں جیسے میں کسی اور بدن کا ہاتھ لگا رہا ہوں۔ یہ میرا جسم تھا اس میں ایک دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کچھ چیزیں جسم سے باہر آ رہی تھیں کچھ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ پورا وجود ایک انجانے بھاری پن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ساتھ چمٹ جانے والا مکروہ جاندار۔ یکلخت مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی کیڑے کے اندر قید ہوں۔

''ساڑھے تین بج گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ہم چونکہ گئے، ہم بھول گئے تھے کہ وقت گزر رہا ہے رات ایک سیاہ عفریت کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شام کب اختتام کو پہنچی؟ رات کب شروع ہوئی؟ جون ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگا۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔ میں کیوں مروں؟ میں نہیں مروں گا۔

اس نے اپنے بازو ہوا میں بلند کئے اور کوٹھڑی میں ادھر ادھر بھاگنے لگا پھر وہ سسکیاں لیتا ہوا ایک کونے میں ڈھیر ہو گیا۔ ہر چند کہ جون پاگلوں کی طرح شور مچا رہا تھا لیکن حقیقت میں وہ مجھ سے اور ٹام سے زیادہ اچھی حالت میں تھا۔

وہ اس بیمار آدمی کی طرح تھا جو بیماری کا مقابلہ اپنے بلند ہوتے درجہ حرارت سے کرتا ہے لیکن جب مریض کی حرارت بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہو تو یہ زیادہ خطرناک علامت ہوتی ہے میں اور ٹام ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

جون رو رہا تھا اسے خود پر رحم آ رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنی حالت پر دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ مگر اس کے برعکس میں نے چھوٹے کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں غیر انسانی طور پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔

''میں باوقار انداز میں مروں گا'' میں نے خود کو کہتے سنا۔

صبح کے آثار دیکھنے کے لئے ٹام چھت کے نیچے سوراخ کے نیچے جا کھڑا ہوا جب سے ہمیں ڈاکٹر نے وقت بتایا تھا ہم اپنی زندگی کو قطرہ قطرہ ختم ہوتے دیکھ رہے تھے۔

''سن رہے ہو؟'' ٹام کی وحشت زدہ آواز آئی۔

''ہاں''

''ابھی رات باقی ہے لیکن انہوں نے احاطے میں چلنا شروع کر دیا ہے معلوم نہیں کم بختوں کا کیا ارادہ ہے بہر حال اندھیرے میں تو گولی نہیں ماریں گے''

''روشنی ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے'' میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ مجھے آسمان پر اندھیرے کی گہرائی کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں ماحول کا رنگ بدلنے لگا۔ دور کہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ طلب کی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دروازے کی آہٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک افسر چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''ٹام؟ افسر نے پوچھا

ٹام خاموش رہا۔ مگر گارڈ نے اس کی سمت اشارہ کر دیا۔

''جون؟''

''وہ۔۔۔۔ وہ جو فرش پر بیٹھا ہے''۔ گارڈ بولا

''اٹھو''۔ افسر نے جون سے کہا۔

جون نے خود مزید سمیٹ لیا۔ سپاہیوں نے اس کی بغلوں میں بازو ڈالے، اور گھسیٹ کر کھڑا کر دیا، لیکن جوں ہی سپاہی ہٹے، جون پھر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہیوں نے افسر کی جانب دیکھا۔

''اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا'' افسر نے کہا' اور پھر ٹام کی سمت گھومتے ہوئے بولا۔ ''چلو تم میرے ساتھ چلو''۔

ٹام دو سپاہیوں کے درمیان افسر کے ساتھ روزانہ ہو گیا۔ بقیہ دو سپاہیوں نے چھوٹے کو اٹھا لیا۔ وہ بے ہوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں بن رہی تھیں۔ میں کھڑا ہوا تو افسر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔

''تمہارا نام پابلو ہے''؟

''ہاں''

''تم یہیں رکو تمہیں بعد میں لے جائیں گے''

ڈاکٹر اور دوں گارڈ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اب میں بالکل تنہا تھا مجھے وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ہر آواز پر میں کانپ اٹھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنے بال کھینچوں اور زور زور سے چیخوں لیکن میں نے اپنے ہات جیبوں میں ڈال لیے اور ہونٹوں کو سختی سے دبا لیا۔ میں باوقار انداز میں مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے میں وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور اس قدر گرم تھا کہ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ یہاں دو افسر اپنے گھٹنوں پر کاغذات پھیلائے بیٹھے تھے۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں''

''ریمون کہاں ہے؟''

کچھ دیر بعد وہ مجھے دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے چل پڑے۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک ہمارے قدموں تلے سے ایک چوہا نکل کر دوسری طرف بھاگا۔ مجھے یہ منظر بہت دلچسپ لگا۔

''چوہا!تم نے دیکھا؟ چوہا تھا''۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا۔ سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ ایک مرتبہ میں ہنس پڑا تو ہنستا چلا جاؤں گا۔ رُک نہیں سکوں گا۔ ہنسی سے بچنے کے لئے میں نے بڑی مونچھوں والے سپاہی کو غور سے دیکھا اور کہا۔

''احمق تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ دینی چاہئیں''

اس نے نیم دلی سے مجھے لات مارنے کی کوشش کی، مگر کچھ بولنے سے گریز کیا۔

''تم نے اچھی طرح سوچ لیا؟'' دوبارہ سامنا ہونے پر موٹے افسر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے افسروں کو غور سے دیکھا۔ وہ ایسے کیڑے لگ رہے تھے۔ جو صرف مخصوص موسموں میں دکھائی دیتے ہیں۔

''میں جانتا ہوں ریمون کہاں ہے؟ میں نے روانی سے کہا۔ وہ مرکزی قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ کسی دھنسی ہوئی قبر کے اندر یا گورکن کی چار دیواری میں''۔

بس میرا جی چاہا تھا کہ ان سے مذاق کروں۔ وہ میرے ہاتھوں بے وقوف بنیں اچھل اچھل کر پیٹیاں کسیں۔ ٹوپی سیدھی کریں۔ اور بے معنی احکامات جاری کریں۔

اور وہ واقعی اُچھل پڑے تھے۔

''خوب! ٹھیک ہے! اچھا پندرہ آدمی تیار کرو۔ فوراً

اور تم موٹے افسر نے روانگی سے قبل مجھے مخاطب کیا۔۔۔۔ اگر تم نے سچ بولا ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ ورنہ تم پچھتاؤ گے۔

وہ شور مچاتے رخصت ہو گئے۔ اور میں اطمینان سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے تصور کیا کہ اس لمحے وہ قبر کے پتھر الٹ رہے ہوں گے۔ گورکن کی چار دیواری میں کود رہے ہوں گے۔ اپنی ناکامی پر برے برے منہ بناتے، قبرستان کی جھاڑیوں میں اُچھلتے کودتے وردی پوش۔ میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں میں اپنی سزا سننے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

''اسے بیرونی احاطے میں لے جاؤ۔ فوجی کاروائی ختم ہونے کے بعد، اس کا فیصلہ شہری انتظامیہ کرے گی''

مجھے یوں لگا جیسے میں نے غلط سنا ہو۔

''تو۔۔تو مجھے گولی نہیں ماری جائے گی۔'' میں نے پوچھا

''نہیں''

''لیکن۔۔۔۔کیوں؟''

اس نے لاعلمی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے اور خاموش ہو گیا۔ سپاہی مجھے باہر کی جانب گھسیٹنے لگا۔ بیرونی احاطے میں سیکڑوں کی تعداد میں بچے عورتیں اور بوڑھے قیدی جمع تھے۔ قیدیوں کے درمیان چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں آہستہ آہستہ پاگل ہو رہا ہوں۔ دوپہر کے وقت ہمیں کھانا دیا گیا۔ کھانے کے دوران مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے وقت چند نئے قیدی احاطے میں دھکیلے گئے میں نے اپنے محلے کے دکاندار پہچان لیا اس کا نام گارشیا تھا۔

''تم زندہ ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''مجھے موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ معلوم نہیں کیوں''۔

''مجھے دو بجے گرفتار کیا گیا۔ گارشیا نے بتایا۔

''کیوں تمہارا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا''

''جو بھی ان کی طرح نہیں سوچتا، وہ اسے گرفتار کر رہے ہیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گارشیا دبے لہجے میں بولا ''وہ ریمون کی تلاش میں کامیاب ہو گئے'' مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''کب؟''

''آج صبح۔ ریمون نے عجیب احمقانہ حرکت کی۔ وہ چچا کے لڑکے سے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اسے کئی لوگ پناہ دینے کو تیار تھے مگر وہ کہنے لگا کہ پابلوں ہوتا تو میں اس کے گھر رہتا۔ وہ میرا دوست تھا مگر جب وہی گرفتار ہو گیا تو اس میں دوسروں کا احسان کا احسان کیوں لوں۔ میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا۔

''قبرستان میں؟''

''ہاں بس ریمون سے یہی غلطی ہوئی۔ صبح وہ وہاں آ گئے۔ یہ ہونا ہی تھا ظالموں نے اسے دیکھتے ہی گولیوں سے اڑا دیا۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں''

ہر چیز دائرہ دار گھومنے لگی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں زمین پر بیٹھا تھا۔اچانک میں اتنی زور سے ہنسا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ٹالسٹائی کے بعد چیکوسلاواکیہ کا''فرانز کافکا'' آئرلینڈ کا''جیمز جوائس''اور فرانس کا''جین پال سارتر''عالمی ادب کے افق پر عہد ساز ادیبوں کی حیثیت سے طلوع ہوئے۔''کافکا''

اپنی تخلیق کردہ خواب آلود دنیا اور اس کے عجوبہ مکینوں کو کسی منطقی انجام کی بنیاد فراہم کئے بغیر

انتقال کر گیا۔اور''جوائس'' نے زبان کے سمندر میں اس وقت شناوری کی جب وہ جزر کی حالت میں تھا۔نتیجتاً اس کی رفت تو قابلِ دید تھی مگر باز آمد ناممکن ثابت ہوئی۔خالص قدرتِ کلام،خطیب کا نشتر ہے کہ وہ اس میں اپنی آواز کے نشیب وفراز سے بے پناہ کاٹ پیدا کر سکتا ہے،مگر کتاب تمام الفاظ یکساں لہجے میں ادا کرتی ہے یوں اس مقام پر جوائس کی تحریروں کے پیدائشی حسن میں کمی واقع ہوئی لیکن سارتر ان عیوب سے ماورا ہے۔

اسی لئے جین پال سارتر بیسویں صدی کی عظیم ترین ادبی شخصیت ہے۔کافکا، جوائس اور سارتر بنیادی طور پر مساوی ادبی صلاحیتوں کے حامل تھ۔مگر سارتر کو بقیہ دونوں ادیبوں پر فلسفہ دانی اور ذاتی فلسفیانہ نقطہ نظر رکھنے کی فوقیت حاصل ہے۔اور فلسفے میں اس کا موقف نہایت جدید معلوم ہونے کے باوجود دراصل اتنے قدیم اور مستند نظریہ زندگی کی ایک شاخ ہے کہ''زندہ وجود'' کی اہمیت پر سارتر کے اصرار پر کوئی باشعور شخص اعتراض کر ہی نہیں سکتا

''تم حیات ہو''اس لئے تم ہی زمانہ،اور تم ہی کائنات ہو''

اگر تم خود پر حیران ہوئے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی حیرت ہوگی اور اگر خود سے ڈر گئے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا خوف ہے''

سارتر اپنی بے پناہ ادبی صلاحیتوں کے ساتھ اس فلسفہ زیست کی تہہ میں اتر گیا کبھی کبھی وہ اپنا ناول افسانہ یا مضمون ہاتھ میں لیے سطح پر آتا اور دنیا

کو حیرت زدہ کر کے دوبارہ خود میں اتر جاتا۔اس کا ناول متلاہٹ دنیا کا واحد ناول ہے جو عام تصورِ حیات سے ماورا ہونے کی نہایت سنجیدہ تعلیم دینے کے دوران ناول نگاری کے فن کی انتہا پر بھی قائم رہتا ہے۔عالمی ادب کے دیگر تمام عظیم ناولوں میں جہاں فلسفے کی گہرائی آتی ہے وہاں داستان گوئی کی چاشنی ختم ہو جاتی ہے اور جہاں قصہ خوانی کا فن ابھرتا ہے وہاں گہرائی کا عنصر کم ہونے لگا ہے۔

سارتر فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔تاریخِ علم وادب میں اتنی بڑی سطح پر یہ واقعہ تیسری مرتبہ پیش آیا۔افلاطون اور نطشے کے بعد اب سارتر کی شخصیت بھی فلسفے کے بلند امتزاج کی علامت بن گئی ہے۔

''متلاہٹ'' کے علاوہ سارتر اپنے افسانے''دیوار'' میں بھی زندگی کا ہولناک رُخ دکھانے میں کامیاب ہوا ہے۔انسان دراصل ایک مخصوص شعور کا نام ہے۔یہ شعور انفرادی سطح پر ایک''زندہ وجود'' سے وابستہ ہوتا ہے۔اور زندہ وجود کو ایک ایسی کائنات میں زندہ رہنا ہوتا ہے جو کسی ضابطہ حیات کی پابند نہیں ہے۔آفاقی اصول موجود ہیں مگر ہر ذی نفس کو ذاتی سطح پر مکمل بے یقینی کی فضا میں سانس لینا ہوتا ہے۔فرد کے لئے افق لاقانونیت پھیلی ہے۔

فرد سے کائنات کی لاتعلقی کے احساس سے''دیوار'' کے مرکزی کردار پر اچانک اپنے عقائد اور نظریات کی لایعنیت واضح ہوتی ہے۔اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ اصول جنہیں اس نے تمام عمر مقدس سمجھا درحقیقت خود ساختہ اور بے بنیاد تھے۔آخری کوشش کے طور پر وہ اپنی انا سلامت رکھنا چاہتا ہے مگر اتفاقاتِ زمانہ میں فرد کی انا بھی ناچیز اور بے وقعت ثابت ہوتی ہے۔یہ بے بسی کی انتہا ہے،اور اس لرزہ خیز صورت حال کے فنکارانہ اظہار نے''دیوار'' کو عہدِ جدید کا عظیم افسانہ بنا دیا ہے۔اگر''دیوار'' کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا افسانہ قرار

دیا جائے تو بحث کے لئے صرف''کافکا'' کا فن کار ہی اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆__ ادارتی مضامین __☆

1_ پاکستان کی عالمی دہشتگردی اور بلوچ قومی مسئلہ

2_ بلوچستان اور زرد صحافت

3_ بریدہ لاشوں کا انبار بلوچستان سے سندھ تک

4_ بلوچ وسائل کی لوٹ مار

5_ افغانستان سے امریکی انخلاء کے خطے پر اثرات

6_ بلوچ پناہ گزینوں کے خلاف پاکستانی جارحیت

7_ بلوچستان میں چینی اسلحہ، عربی پیسے اور پاکستانی فوج کی دہشت گردی

8_ پشتونوں کے علیحدہ صوبے کا مطالبہ اور بلوچوں کا موقف

پاکستان کی عالمی دہشتگردی اور بلوچ قومی مسئلہ

☆ __________ ☆

بیسویں صدی میں جو بھی اقوام دنیا کے نقشے پر ایک ریاست کے صورت میں ابھرے ان تمام اقوام میں ایک قدر مشترک تھی کہ سب میں قومیت کا احساس تھا اور سب مشترکہ تاریخ رکھتے تھے لیکن پاکستان میں غیر فطری طور پر باندھے گئے اقوام نامشترکہ تاریخی پس منظر رکھتے ہیں نا ان کے مفادات مشترک ہیں اور نا ہی ان میں کبھی بھی ایک قوم ہونے کا احساس رہا ہے حتیٰ کے 1940 تک لفظ پاکستان تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ پاکستان کے قیام کا فیصلہ انگریز قابضوں نے اپنے قبضے کے آخری دور میں مستقبل میں اپنے علاقائی مفادات کی تکمیل کی بجا آوری کی خاطر کیا۔ جس طرح پاکستان کا قیام غیر فطری اور دوسرے اقوام کے استحصال پر ہوا اسی طرح پاکستان کا وجود بھی دوسرے اقوام کے استحصال پر قائم ہے۔ بلوچ، سندھی اور پشتون جیسے اقوام کو زبردستی اس ریاست کے ساتھ باندھنے کے بعد انہیں قابو میں رکھنے کیلئے یہاں اختیار قابض انگریز کے بنائے ہوئے پنجابی آرمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور ورثے میں اسے جنگی ساز وسامان سے لیس کر کے مضبوط بنایا گیا جس سے نا صرف وہ پہلے سے غلامی کا شکار اقوام کو آسانی سے قابو کر سکے بلکہ طاقتور ہونے کی وجہ سے وہ امورِ ریاست پر اختیار دار ہوگئے۔ پاکستان کے قیام نے اس خطے میں طاقت کے توازن پر بہت برا اثر ڈالا اپنے قیام کے اگلے ہی سال پاکستان نے کشمیر پر بھارت سے جنگ چھیڑ دی پھر اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کیلئے انہوں نے بھارت میں دراندازی اور دہشتگردی کا ایک نارکنے والا سلسلہ شروع کردیا جس کی وجہ سے ان کے بیچ تین بڑی جنگیں ہو چکی ہیں تینوں میں شکست کھانے کے باوجود پاکستان اب تک مسلسل سرحدی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے اور اپنے فوجیوں اور بنائے ہوئے پراکسیوں کو مجاہدین کا نام دے کر بھارت روانہ کرتا رہا ہے جو ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے دوسری طرف پاکستان نے اپنے قیام کے ساتھ ہی افغانستان کو اپنا غیر فطری پانچواں صوبہ سمجھنے لگا اور اس کے معاملات میں مداخلت شروع کردی سرد جنگ کے دور میں ثور انقلاب کے بعد جب روس نے افغانستان میں پیش قدمی کی تو پاکستان کو ایک موقع مل گیا مغربی ممالک کی پشت پناہی حاصل کرنے کے بعد پاکستان نے اپنے فوج کی مدد سے مدارس کے طلباء کو ٹریننگ اور اسلحہ دیکر افغانستان بھیجنا شروع کردیا جو بالآخر طالبان کے شکل میں افغانستان پر قابض ہوگئے۔ اس طرح پاکستان ایک پراکسی جنگ کے ذریعے افغانستان میں بھی بدترین مداخلت کا مرتکب ہوا اور ہمیشہ کیلئے افغانستان کا امن تباہ کردیا۔ گو کہ پاکستان اور ایران بلوچ مسئلہ کے اوپر مشترک سوچ رکھتے ہیں اور ان میں اتحاد بھی ہے لیکن اسلامی انقلاب کے بعد شیعہ حکومت بننے کے بعد پاکستان اور ایران کے تعلقات خراب رہے۔ مسلم دنیا کے بے تاج بادشاہ ہونے کے دعویدار سعودی حکمرانوں نے پاکستان کی مدد سے کئی شیعہ مخالف پراکسی تنظیمیں بنا کر شیعہ رجیم کے خلاف ایک جنگ شروع کردی یعنی پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی اپنے تمام ہمسایہ ممالک کیلئے ایک خطرہ اور مسئلہ بنا ہوا ہے۔ پاکستان کے دراندازی اور دنیا کے امن کو تباہ کرنے کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اپنائے ہمسائے ممالک کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کیلئے خطرہ بن گیا۔ افغانستان میں مداخلت کیلئے بنائے پراکسی گروپ جیسے کے طالبان، کشمیر میں مداخلت کیلئے بنائے گئے شدت پسند گروپ جیسے کہ جیشِ محمد وغیرہ اور ایران کے مخالف میں بنائے گئے انٹی شیعہ شدت پسند گروہ جیسے کے لشکر جھنگوی سب پاکستانی فوج کا تزویراتی گہرائی بن گئے، وہ فوج سے بے تحاشہ پیسہ اور اسلحہ حاصل کرنے کے بعد اس حد تک طاقتور ہوگئے ہیں کہ اس خطے میں ایک غیر اعلانیہ الگ ریاست چلا رہے ہیں اور انہیں پاکستانی فوج

پاکستان اور ایران بلوچ مسئلہ کے اوپر مشترک سوچ رکھتے ہیں اور ان میں اتحاد بھی ہے لیکن اسلامی انقلاب کے بعد شیعہ حکومت بننے کے بعد پاکستان اور ایران کے تعلقات خراب رہے۔ مسلم دنیا کے بے تاج بادشاہ ہونے کے دعویدار سعودی حکمرانوں نے پاکستان کی مدد سے کئی شیعہ مخالف پراکسی تنظیمیں بنا کر شیعہ رجیم کے خلاف ایک جنگ شروع کردی یعنی پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی اپنے تمام ہمسایہ ممالک کیلئے ایک خطرہ اور مسئلہ بنا ہوا ہے

کے مکمل خفیہ پشت پناہی بھی حاصل ۔ یہ گروہ نا صرف اپنے ارگرد کے ممالک بلکہ پوری دنیا میں دہشت گردی کے بڑے واقعات میں ملوث ہیں۔ حال ہی میں جاری کردہ رپورٹ میں بھی یہ ظاھر کیا گیا ہے کہ مغربی ممالک اور امریکہ میں ہونے والے دہشت گردی کے تمام واقعات کے تانے بانے جا کر پاکستان سے ہی ملتے ہیں پاکستان اس خطے میں ایک نا سور کے صورت میں سامنے آیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ناسور ٹھیک نہیں بلکہ مزید بدتر ہوجاتا ہے اس لیئے پاکستان کا وجود اب خطرے کی ایک علامت بن چکا ہے۔ بھارت میں مودی سرکار آنے کے بعد پاکستان نے ایک بار پھر کنٹرول لائن کی شدید مخالفت شروع کردی جس کے بعد سے ابتک ایل اوسی پر ایک دوسرے پر چھوٹے چھوٹے حملوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا ہے، معاملات کو اس حد تک پہنچانے کی سب بڑی وجہ پاکستانی حکام کا کشمیری حریت رہنماوں سے ملاقات کو بتایا جاتا ہے جبکہ اس پر بھارت نے بھی میڈیا اور

بھارت نے اعلیٰ سطح پر بلوچوں کو ایک الگ قوم کہہ کر مخاطب ہوئے ہیں اور بلوچوں پر پاکستانی قبضہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس سب کے باوجود عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو بھارت اب تک کسی بھی فورم پر بلوچوں کی حمایت کرتے ہوئے نظر نہیں آتا

سفارتی سطح پر احتجاج کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر پاکستان کشمیری حریت رہنماوں سے مل سکتا ہے تو پھر ہم بھی بلوچ رہنماوں سے ملیں گے۔ ماضی میں پاکستان اپنے دراندازی پر پردہ ڈالنے اور اسے جواز دینے کیلئے ہمیشہ بھارت پر الزام لگاتا آیا ہے کہ وہ بلوچ آزادی پسند مسلح گروہوں کی مدد کررہا ہے جبکہ پاکستان اور بلوچ آزادی پسند رہنما دونوں اس الزام کو مسترد کرچکے ہیں، اس مدعے پر پاکستان نے شرم الشیخ میں منموہن کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں باقاعدہ طور پر بلوچستان کا مسئلہ ایجنڈے میں شامل بھی کروایا تھا لیکن بارہا کئی فورموں پر بھارتی حکام کا بلوچستان میں مداخلت پر پاکستان سے ثبوت مانگنے کے باوجود پاکستان آج تک نا کوئی ثبوت پیش کرسکا ہے اور نا ہی کبھی اپنے الزامات کو ثابت کرسکا ہے، لیکن اب بھارت میں حکمران جماعت بھارتی جنتا پارٹی کے سینئر رہنما سبرمنیوسوامی پاکستان کو اس بات کی دھمکی دے چکا ہے کہ وہ بلوچ آزادی پسند قائدین سے رابطہ شروع کریں گے اور پہلی بار بھارت نے اعلیٰ سطح پر بلوچوں کو ایک الگ قوم کہہ کر مخاطب ہوئے ہیں اور بلوچوں پر پاکستانی قبضہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس سب کے باوجود عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو بھارت اب تک کسی بھی فورم پر بلوچوں کی حمایت کرتے ہوئے نظر نہیں آتا۔ پاکستان اور بھارت کی سرحدی کشیدگی ایک طرف اور دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو افغان حکومت بھی پاکستان سے سخت نالاں ہے اور افغانستان میں ہونے والے دہشتگردی کے واقعات کی ذمہ داری پاکستان پر عائد کررہا ہے حال ہی میں پاکستانی فوج نے افغان علاقوں پر راکٹ باری کی ہے جس کی جواب میں افغان فوج بھی پاکستانی زیر قبضہ علاقوں پر راکٹ برسا رہا ہے۔ اسی طرح تیسر طرف ایرانی فوج کے ایک حالیہ حملے میں پاکستانی ایف سی کا ایک صوبیدار ہلاک ہوا تھا یعنی پاکستان ایک وقت میں اپنے ارگرد کے تمام ممالک کیلئے خطرہ بنا ہوا ہے اور پاکستان کے اندر پنپنے والے دہشگرد پوری دنیا میں دہشتگردی کے واقعات کے منصوبہ بندی میں ملوث ہیں، پاکستان وقت کے ساتھ ساتھ نا صرف اس خطے بلکہ پورے دنیا کیلئے ایک شدید تر خطرہ بنتے ہوئے ابھر رہا ہے اب وقت آگیا ہے کہ پوری دنیا پاکستان کے ان توسیع پسندانہ اور دہشت گردانہ عزائم کا قلع قمع کرنے کیلئے کوئی سنجیدہ حکمت عملی اختیار کرے ورنہ پاکستان کے اندر پنپنے والے یہ دہشگرد گروہ کسی بھی وقت پورے خطے کے امن کو داعش کی طرح تہہ وبالا کرسکتے ہیں۔ اب وقت کی ضرورت یہی ہے کہ بھارت سمیت تمام مہذب اقوام بیانات سے بڑھ کر بلوچوں کی مدد کو سامنے آئیں۔ جس طرح عالمی حمایت پاکر کرد مشرقِ وسطیٰ میں ایک مضبوط سیکیولر فورس بن کر ابھرے اور دہشگردوں کے سامنے ایک دیوار بن گئے اسی طرح بلوچوں کی صورت میں اس خطے میں بھی ایک مضبوط سیکیولر قوت ابھر سکتی ہے۔ بلوچ چھ دہائیوں سے زائد عرصے سے اپنے آزادی کیلئے جدوجہد کررہے ہیں اور ایک سیکیولر بلوچ ریاست کے طلبگار ہیں۔ اگر بھارت سمیت باقی مہذب ممالک بلوچوں کی سیاسی وسفارتی حمایت کریں تو بلوچوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اس خطے میں ایک مضبوط سیکولر طاقت کی صورت میں ابھریں اور پاکستان کے اس دراندازی اور عالمی دہشتگردی کے سامنے ایک دیوار بن جائیں۔ ایک مضبوط آزاد سیکولر بلوچستان اس خطے میں امن کو یقینی بنا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بلوچستان اور زرد صحافت

بلوچستان میں جاری بدامنی اور ریاستی دہشگردی کا تقابل اگر کشمیر، فلسطین، جنوبی سوڈان وغیرہ سے کیا جائے تو بلوچستان کو کسی طور مذکورہ علاقوں سے زیادہ پرامن نہیں کہا جاسکے گا، گذشتہ چھ دہائیوں سے بالعموم اور گذشتہ دس سالوں سے بالخصوص بلوچستان میں جس طرح سے ریاستی دہشت گردی کا بازار گرم رکھا گیا ہے اسکی نظیر نہیں ملتی، پاکستانی خفیہ ادارے ہزاروں کی تعداد میں بلوچ سیاسی کارکنان اغواء کرکے لاپتہ کرچکے ہیں جن میں سے سینکڑوں کی مسخ شدہ لاشیں مختلف علاقوں میں انتہائی تشدد زدہ حالت میں سامنے آتی رہی ہیں، جن میں سے 169 لاشیں صرف خضدار کے علاقے توتک سے ایک اجتماعی قبر سے برآمد ہوئیں یہ بھی واحد علاقہ نہیں جہاں سے اجتماعی قبر برآمد ہوا ہے بلکہ خضدار کے ہی علاقے فیروز آباد اور باڈڑی میں اسی طرز کے اجتماعی قبروں کی خبریں گردش کررہی ہیں لیکن پاکستانی خفیہ ادارے ان علاقوں کو عام لوگوں کیلئے ''نوگوایریا'' قرار دے چکے ہیں۔ اسکے علاوہ خفیہ اداروں کے سرپرستی میں کام کرنے والے جرائم پیشہ افراد اور مذہبی شدت پسندوں کے جتھے جنہیں پاکستان فخریہ انداز میں ڈیتھ اسکواڈ کہتا آیا ہے مکمل چھوٹ کے ساتھ اسلحہ کی نمائش کرتے ہوئے بلوچستان میں ہر جگہ آزادی کے ساتھ فوج کے سرپرستی میں گھومتے ہیں اور نہ صرف کئی بلوچ آزادی پسند سیکولر سیاسی کارکنان کو دن دیہاڑے شہید کرچکے ہیں بلکہ ان سیاسی کارکنان کے اہلخانہ حتیٰ کے خواتین کو بھی نشانہ بناتے رہے ہیں۔ پاکستانی جیٹ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کی بلوچ سول آبادیوں پر بمباری، فوجی دستوں کی مدد سے بلوچ علاقوں پر چڑھائی، لوٹ مار، بلوچوں کے گھروں کو جلانا اب روز کا معمول بن گیا ہے۔ صرف گذشتہ دس ماہ کے دوران پاکستان فوج گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ڈیرہ بگٹی، سوئی، نصیر آباد، صحبت پور، کاہان، بارکھان، کوہستان، نیو کاہان، کوئٹہ شہر، مستونگ، جوہان، اسپلنجی، قابو، نوشکی، خاران، قلات، دشت گوران، پنجگور، پروم، مشکے، آواران، جھاو، شاپک، سامی، کلگ، ہیرونک، پیدارک، تمپ، گومازی اور پسنی سمیت کوئی اور علاقوں پر بڑے پیمانے کی فوجی آپریشن کرچکا ہے جن میں سینکڑوں کی تعداد میں بلوچ لاپتہ اور درجنوں شہید کیئے جاچکے ہیں، لیکن اسکے باوجود بلوچستان کا مسئلہ عالمی و علاقائی طور پر کماحقہ توجہ حاصل نہ کرسکی خاص طور پر جس طرح کی توجہ فلسطین، کشمیر وغیرہ جیسے مسئلے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہاں ''میڈیا بلیک آوٹ'' ہے۔ علاقائی سطح پر جتنے بھی بلوچ اخبارات، رسائل وجرائد ہیں خاص طور پر وہ جو بلوچستان کے حالات کو من وعن پیش کرتے ہیں انہیں بے انتہاء مسائل کا سامنا ہے جس میں سب سے بڑا مسئلہ خفیہ اداروں کی دھمکیاں اور ان اخباروں پر حملے ہیں، ان مصائب کی وجہ سے یا تو زیادہ تر اخبارات بند ہوچکے ہیں یا پھر اپنا پالیسی بدل کر بلوچستان کے حالات سے چشم پوشی برت رہے ہیں، ان حالات میں صرف ایک اخبار روزنامہ توار بلوچستان کے حالات کو صحیح معنوں میں پیش کررہا ہے اسے بھی پاکستانی خفیہ اداروں کی جانب سے سخت مشکلات کا سامنا ہے، اس کے دفاتر دو سے زائد مرتبہ جلائے جاچکے ہیں اور مذکورہ اخبار سے منسلک چھ صحافی پاکستانی خفیہ اداروں کے ہاتھوں شہید ہوچکے ہیں۔ آن لائن بلوچ اخبار جن میں قابل ذکر بلوچ ورنا ہے کو پی ٹی اے نے پاکستان میں بلاک کیا ہوا ہے۔ اسی بابت اگر پاکستانی میڈیا کا جائزہ لیا جائے تو وہ بلوچستان کے مسئلے کے حوالے سے زرد صحافت کی اعلیٰ مثال قائم کررہے ہیں۔ پاکستان کے تمام میڈیا ہاوسز بلوچستان میں ہونے والے بدترین انسانی حقوق کی پامالیوں اور قتل عام کو مکمل نظرانداز کررہے ہیں اور اس پر بھی مستزاد یہ وہ خفیہ اداروں کے دباو میں آکر بلوچستان میں پیش آنے والے کسی بھی بڑے واقعے جیسے کے اجتماعی قبروں کے دریافت کو صحافتی بددیانتی کا شکار بناتے ہوئے اس کی اہمیت کم کرنے اور حالات وواقعات کو مسخ کرکے پیش کرتے ہوئے پاکستانی آرمی کے انسانیت سوز کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کا بھی کام کررہے ہیں۔ حتیٰ کے بلوچستان سے شائع ہونے والے کئی اخبارات جو مذہبی شدت پسند گروہوں کے بیانات اور موقف کو سرخیوں میں پیش کررہے ہوتے ہیں، کسی بھی قوم پرست سیکولر بلوچ جماعت کے بیانات اور موقف یکسر چھاپنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ پاکستانی میڈیا کے اسی زرد صحافت کے خلاف بلوچ آزادی پسند تو تیں کئی بار احتجاج کرچکے ہیں لیکن ظاہری اسباب منکشف کررہے ہیں کہ ان میڈیا ہاوسز کو صحافت جیسے مقدس پیشے کے اصولوں سے کئی گنا زیادہ منافع، اشتہارات اور ریٹنگ عزیز ہے، جو یقیناً غیر جانبدار صحافت کی توہین کے زمرے میں آتا ہے۔ جہاں تک سوال ہے عالمی میڈیا کا وہ کسی بھی خبر یا کہانی کیلئے ہمیشہ علاقائی میڈیا پر انحصار کرتا ہے اور علاقائی میڈیا کے بددیانتی کی وجہ سے عالمی میڈیا بھی بلوچستان کے اندرونی حالات کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا کرتا ہے اور جتنی تھوڑی بہت معلومات ان تک پہنچتی ہے اسکا بھی سب سے بڑا ذریعہ بلوچ تارکین وطن اور سوشل میڈیا ہوتا ہے جو یقیناً ناکافی ہے، اسکے علاوہ پاکستانی حکومت اور خفیہ اداروں نے کسی بھی عالمی میڈیا ہاوس یا کسی غیر ملکی صحافی کیلئے بلوچستان میں داخلے پر غیر اعلانیہ پابندی لگایا ہوا ہے۔ ایک طرف پاکستانی میڈیا کی زرد صحافت، دوسری جانب عالمی میڈیا پر پابندی اور ساتھ میں بلوچ میڈیا کو ریاستی اداروں کی جانب سے نشانہ بنانے کی وجہ سے بلوچستان میں جاری بدترین انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور ریاستی دہشتگردی دنیا کے سامنے نہیں آرہی اور پاکستانی اسی امر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے بلوچ نسل کش پالیسوں میں روز بروز شدت لاتی جارہی ہے۔ اب وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ انسانی حقوق کی تنظیمیں اور صحافیوں کی عالمی تنظمیں پاکستانی میڈیا کی زرد صحافت اور بلوچستان کو غیر ملکی صحافیوں کیلئے نوگوایریا بنانے کے خلاف آواز بلند کریں اور عملی اقدامات اٹھائیں۔

☆☆☆

بریدہ لاشوں کا انبار بلوچستان سے سندھ تک

☆__________☆

بلوچستان میں 2009 میں بلوچ رہنما شہید غلام محمد بلوچ کی مسخ شدہ لاش پھینکنے سے قابض پاکستان نے مارو اور پھینکو کی ایک ایسی غیر انسانی پالیسی کا آغاز کر دیا جو پانچ سال گذرنے کے باوجود مکمل زور وشور سے جاری ہے۔اس دوران 1500 سے زائد بلوچوں کی تشدد زدہ مسخ شدہ لاشیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں سے 169 تو صرف ایک اجتماعی قبر سے برآمد ہوئی ہیں۔ایک طرف مسخ شدہ لاشوں کا یہ اندوہناک سلسلہ جاری ہے تو دوسری طرف بلوچ سیاسی کارکنان کے جبری اغواء کا تسلسل جاری رہتے ہوئے تعداد 20000 تک پہنچ چکی ہے۔یہ یقیناً اکیسویں صدی کی بدترین نسل کشی کے زمرے میں آتا ہے۔بلوچ آزادی پسند جماعتوں سمیت انسانی حقوق کے عالمی تنظیمیں ان واقعات کا ذمہ دار پاکستان کو قرار دے رہے ہیں جہاں پاکستان آرمی کے خفیہ ادارے بلاواسطہ اس قتل عام کا مرتکب ہو رہا ہے۔بلوچستان میں ان بے رحمانہ پالیسیوں کے بعد اب پاکستانی خفیہ ادارے اسی مارو اور پھینکو پالیسی کو سندھ میں من وعن نافذ کرتے ہوئے سندھی آزادی پسند قیادت اور سیاسی کارکنان کو شہید کرنے کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں۔پاکستان کے اس انسانیت سوز پالیسی کا شکار زیادہ تر جیئے سندھ متحدہ محاذ، جیئے سندھ قومی محاذ (بشیر قریشی)، جیئے سندھ قومی محاذ (آریسر)، جیئے سندھ تحریک اور انکے ذیلی طلباء تنظیم بن رہے ہیں۔خفیہ ادارے طویل عرصے سے سندھی آزادی پسند کارکنوں کو اغواء کر رہے تھے لیکن جیئے سندھ متحدہ محاذ کے سینئر وائس چیئرمین سرائی قربان اور اس کے پانچ ساتھیوں کو شہید کر کے زندہ جلانے سے شہادتوں کا بھی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔اس وقت تک جیئے سندھ متحدہ محاذ کے سیکریٹری جنرل مظفر بھٹو کو شہید کر کے مسخ شدہ لاش پھینکنے، جیئے سندھ قومی محاذ کے چیئرمین بشیر قریشی کو مبینہ طور پر زہر دیکر شہید کرنے سمیت کئی کارکنان کو اغواء کر کے انکی مسخ شدہ لاشیں پھینکی جا چکی ہے۔ایشین ہیومن رائٹس کمیشن کے ایک رپورٹ کے مطابق صرف 2014 کے اندر ابتک 100 زائد سندھی آزادی پسند سیاسی کارکنان کو اغواء کیا جا چکا ہے۔اسی ماہ نومبر میں پاکستانی خفیہ ادارے مہران یونیورسٹی کے ایک طالبعلم اور متحدہ محاذ کے کارکن کملیش سندھی کو یونیورسٹی سے جبکہ سندھ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کے چیئرمین فیاض شیخ کو کراچی سے اغواء کر چکے ہیں۔اسی طرح 7 نومبر کو متحدہ محاذ کے کشمور زون کے رہنما پریال شاہ کی مسخ شدہ لاش رحیم یار خان سے منظر عام پر آئی جسے 15 اکتوبر کو پاکستانی خفیہ اداروں نے اغواء کیا تھا،ان کے بھائی ضامن شاہ کو اس سے پہلے خفیہ اداروں نے ایک جعلی مقابلے میں شہید کر دیا تھا،یاد رہے پریال شاہ کو دھمکیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب انہوں نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے لانگ مارچ کے دوران ایک دن کیلئے انکی کشمور میں مہمان نوازی کی تھی۔اسی طرح جیئے سندھ قومی محاذ (آریسر) کے رہنما عبدالوحید لاشاری کی بھی مسخ شدہ لاش اسی ماہ پھینکی گئی تھی اسے خفیہ اداروں نے شہادت سے 15 روز قبل دورانِ سفر بس سے اتار کر اغواء کیا تھا۔تازہ ترین واقعے میں 25 نومبر کو متحدہ محاذ کے ضلعی رہنما آصف پہنور کی مسخ شدہ لاش پھینکی گئی انہیں 15 اگست کو پولیس نے اسکے ایک دوست کے گھر سے چھاپہ مار کر گرفتار کیا تھا جسے بعد میں خفیہ اداروں کے تحویل میں دیا گیا جہاں اسے تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد شہید کر کے انکی مسخ شدہ لاش پھینکی گئی۔ان واقعات کے خلاف جیئے سندھ متحدہ محاذ نے 10 روزہ سوگ کا اعلان کیا ہے اور 30 نومبر کو سندھ بھر میں پہیہ جام شٹر ڈاون ہڑتال کی کال دی ہے جس کی حمایت باقی تمام قوم پرست سندھی تنظیموں کے ساتھ ساتھ بلوچ قوم پرست پارٹی بی این ایم اور بی آر پی نے بھی کی ہے۔اسی ضمن میں حال ہی میں ایشین ہیومن رائٹس کمیشن نے ایک رپورٹ جاری کرتے ہوئے پاکستان کو ان غیر انسانی مظالم کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے یہ الزام عائد کی ہے کہ پاکستانی خفیہ ادارے اب بلوچستان کی طرح سندھ میں بھی قوم پرستوں کو کاونٹر کرنے کیلئے مذہبی انتہاء پسند گروہوں کو کھلی چھوٹ دیکر وہاں مضبوط کر رہی ہے اور ساتھ میں یہ اپیل کی ہے کہ پاکستان یہ ماورائے عدالت وقانون قتل کے سلسلے کو ختم کر دے۔بلوچ آزادی پسند تنظیمیں ایک طویل عرصے سے پاکستان پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں بلوچ سیاسی کارکنان اغواء اور سینکڑوں شہید کر چکا ہے اسی ضمن میں وہ عالمی برادری سے اپیل کرتے رہے ہیں کہ وہ اس انسانی المیہ کے روک تھام میں اپنا کردار ادا کریں لیکن اب تک نہ عالمی برادری اور نہ ہی کسی بھی انسانی حقوق کے عالمی ادارے کی جانب سے کوئی مثبت پیش رفت سامنے آئی ہے اب اسی سفاکانہ سلسلے کا سندھ میں آزادی پسند کارکنان کے خلاف آغاز ظاہر کرتا ہے کہ اگر عالمی ادارے اسی طرح مہر بہ لب رہے تو اس خطے میں ایک اور ہولوکاسٹ کی تاریخ لکھی جائیگی اور اس بار گستاپو کا کردار پاکستانی خفیہ ادارہ آئی ایس آئی ادا کرے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

______ بلوچ وسائل کی لوٹ مار

بلوچستان کی وسیع ساحل، بیش بہا وسائل اور اہم جغرافیائی محل وقوع ہمیشہ سے اس کا خاصہ رہے ہیں اور یہی ہر دور کے طاقت وقت کے دل میں بلوچستان فتح کرنے کی امنگیں جگاتے رہیں، نوشیروان عادل سے لیکر پاکستان تک تمام طالع آزما اس زمین پر اپنے جھنڈے گاڑھنے اور لوٹ مچانے کیلئے لاؤلشکر کے ساتھ وارد ہوتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس سرزمین کے حقیقی مالک بلوچ پوری تاریخ کبھی اپنے دفاع تو کبھی اپنے آزادی کیلئے بیرونی حملہ آوروں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ جدید نوآبادیاتی نظام میں لوٹ مار کے روایتی معنی وتشریح بدل چکے ہیں لیکن آج بھی بلوچستان پر پاکستانی قبضے کے بنیادی اسباب جاننے کی کوشش کریں تو اسکے محرکات یہی زروزمین کی لوٹ مار کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ گذشتہ 66 سالوں کے استحصالی تاریخ پر غور کیا جائے کہ سوئی سے لیکر گوادر، چمالنگ سے لیکر سینڈک تک اور ریکوڈک سے لیکر گڈانی شپ بریکنگ یارڈ تک فائدے صرف قابض حاصل کرتا رہا ہے اور ایک عام بلوچ کی زندگی قرون وسطٰی کے کسی چرواہے سے بڑھ کر اپنا معیار نہیں بڑھا سکا۔ ایک تخمینہ کے مطابق اس وقت بلوچستان میں کم از کم 20 کروڑ میٹرک ٹن کوئلہ، 2 لاکھ میٹرک ٹن کرومائیٹ، 3 لاکھ میٹرک ٹن بیرائیٹ، 1 لاکھ میٹرک ٹن سلفر، بہت ہی کثیر تعداد میں ماربل، 2 کروڑ میٹرک ٹن جپسم، 27 کروڑ 50 لاکھ میٹرک ٹن کے برابر آئرن اور، 16 کروڑ میٹرک ٹن زنک، 300 میٹرک اونس سے زائد سونا، 50 میٹرک ٹن سے زائد چاندی اور صرف ضلع چاغی میں ایک ارب 23 کروڑ میٹرک ٹن تانبا موجود ہے۔ ان کے علاوہ بلوچستان میں ڈولومائیٹ، فلورائیٹ، لائم اسٹون، ییونائس سمیت 60 سے زائد اور معدنیات کے علاوہ کم از کم 19 ٹریلین مکعب فٹ گیس اور 6 ٹریلین بیرل تیل موجود ہے۔ اس وقت پاکستان، صرف تیل وگیس کے مد میں بلوچستان سے 42 بلین ڈالر سالانہ لوٹ رہا ہے، یہ بلوچستان کے لوٹتے وسائل کا محض ایک خفیف تخمینہ ہے اس سے اندازہ ہوتا پاکستان کیوں بلوچوں کے نسلیں مٹانے پر تو راضی ہے لیکن اپنے قبضے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔

گذشتہ کچھ دنوں سے بلوچستان کا علاقہ ریکوڈک موضوع بحث ہے، بلوچستان کے شمال مغربی ضلع چاغی میں واقع ریکوڈک کے بارے میں تخمینہ لگایا جاتاہ ہے کہ یہاں سے سالانہ 200000 ٹن تانبا ، 250000 اونس سونا اور 600000 ٹن دوسرے معدنیات کی پیداوار متوقع ہے اور عالمی منڈی کے موجودہ قیمتوں کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو ریکوڈک سے سالانہ 3.64 بلین ڈالر کی آمدنی متوقع ہے۔ اس معدنی ذخیرہ کی عمر 55 سال بتائی جاتی ہے اور اس دوران اس سے 200 بلین ڈالر سے زائد کی آمدنی متوقع ہے ۔ ایک طرف ان وسیع ذخائر کے حقیقی مالک بلوچ آج بھی ان وسائل اور انکے آمدنی سے وسائل پر اختیار نار کھنے کی وجہ سے محروم ہے تو دوسری طرف قابض پاکستان ان وسائل کو عجلت میں کوڑیوں کے دام بیچ رہا ہے۔ ابتداء میں ریکوڈک کا ٹھیکہ ٹیتھیان کاپر کمپنی کو دیا گیا لیکن بعد میں اطلاعات کے مطابق ریکوڈک کے لوٹ مار کیلئے پاکستانی فوج اور چین کی گھ جوڑ کی وجہ سے یہ بہانہ بنا کر کہ ٹیتھیان نے مقررہ وقت تک علاقے کے وسائل کا فیزیبلٹی رپورٹ پیش نہیں کیا اور وسائل کی قیمت بہت کم بیان کی ان کا یہ ٹھیکہ منسوخ کر دیا پھر چار پاکستانی اور چینی کمپنیوں کو اسکا ٹھیکہ دے دیا گیا، ان چاروں کمپنیوں کو جب یہ ٹھیکہ دیا گیا تھا تو اس وقت انہیں بنے صرف ایک ماہ گذرا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں کو صرف ریکوڈک کے غرض سے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ٹیتھیان کاپر کمپنی نے اس بابت عالمی عدالت میں کیس دائر کر دیا ہے۔ ایک طرف عدالتوں میں یہ کیس چل رہا تھا تو دوسری طرف دروں خانہ قابض پاکستان اور بلوچستان میں اسکی گماشتہ کٹھ پتلی ڈاکٹر مالک کی نیشنل پارٹی ان وسائل کو کوڑیوں کے دام بیچنے کیلئے ساز باز کر رہے تھے۔ اس معاملے نے اس وقت ڈرامائی رخ اختیار کر لیا جب پاکستان کے ایک سینئر صحافی ڈاکٹر شاہد مسعود نے یہ انکشاف کیا کہ ٹیتھیان کی ڈیل ہو چکی ہے جس کے تحت ٹیتھیان کمپنی کسی اور نام سے یہ ٹھیکہ حاصل کرے گی اور اس کے عوض وہ 216 ملین ڈالر کی خطیر رقم رشوت کے صورت میں نوازشریف کو دے گی جو لندن میں اسکے بیٹے کے اکاونٹ میں ٹرانسفر ہونگے، اسکے علاوہ کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر مالک کو 29 ملین ڈالر ملیں گے جو دبئی میں اسکے کسی رشتہ دار شاہد بلوچ کے ٹویٹا شوروم کے اکاونٹ میں منتقل ہونگی، اسکے علاوہ حاصل بزنجو، ثناء اللہ زہری اور محمود خان اچکزئی کو اس میں سے دو دو فیصد رقم ملے گی، پاکستانی صحافی فوج کا نام لینے کی جسارت نہیں کر سکا لیکن یہ بات واضح ہے کہ ایسی کوئی بھی ڈیل پاکستانی فوج کے بغیر ممکن نہیں اور یقیناً ان کا بھی ایک خطیر حصہ ہوگا جو ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ اس لین دین اور لوٹ مار سے ایک طرف قابض کے عزائم بھی صاف ظاہر ہو رہے ہیں کہ وہ بلوچستان میں آزادی پسندوں کے ابھرتے قوت سے خوفزدہ ہو کر عجلت میں بلوچستان کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو دوسری طرف نام نہاد ریاستی گماشتہ قوم پرستوں کی بھی اصلیت ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو اقتدار میں لانے کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس ڈیل میں بلوچوں کی رضا شامل ہے۔ تاہم حقیقی بلوچ قوم پرست قوت جو ہمیشہ سے بلوچ استحصال کو نمایاں کرتے نظر آئیں ہیں نے اس بابت موقف اختیار کیا ہے کہ بلوچوں کا ان استحصالی منصوبوں میں بالکل بھی رضا ومنشا شامل نہیں اور انہوں نے ملٹی نیشنل کمپنیوں اور خاص طور پر چین کو تنبیہہ کی ہے کہ وہ بلوچوں کے منشاء کے بغیر پاکستان سے کسی بھی قسم کا معاہدہ نا کریں بلوچ کسی بھی ایسے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیں گے اور یہ کمپنیاں اپنے سرمایہ کاری کے نقصان کا ذمہ دار خود ہونگے، انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بلوچستان کے آزادی کے بعد جب بلوچ اپنے اختیارات کا خود مالک ہونگے تو وہ خود دوسرے ممالک اور کمپنیوں سے اپنے شرطوں پر معاہدات کریں گے تب تک وہ پاکستان کے کیئے کسی بھی معاہدے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ☆

افغانستان سے امریکی انخلاء کے خطے پر اثرات

☆ ________ ☆

2010 میں ہونے والے لندن کانفرنس میں جہاں دنیا کے سربراہان مملکت نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ افغانستان سے افواج کے انخلاء کا ایک ٹائم ٹیبل مرتب کیا جائے گا اور دفاع کی ذمہ داری سلسلہ وار طریقے سے افغان فوج کے حوالے کیا جائے گا اور اسکے بعد جون 2011 میں بارک اوبامہ کی تقریر جس میں اس نے افغانستان سے امریکی افواج کے انخلاء کے ٹائم ٹیبل کا اعلان کیا تھا نے یہ واضح کر دیا کہ 2014 کے بعد افغانستان کے حالت اس طرح نہیں رہیں گے جس طرح گذشتہ 13 سال سے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ 2014 کے بعد افغانستان کے ساتھ امریکی تعلق کی نوعیت یکسر بدل جائیگی۔ مقررہ وقت پر جب افغانستان سے امریکی اور ایساف افواج کا انخلاء شروع ہو گیا تو اسکے ساتھ ہی اس بحث کا بھی آغاز ہو گیا کہ افواج کے انخلاء کے اثرات علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر کیا ہونگے۔ اسکے ساتھ ہی خطے کے بدلتے ہوئے صورتحال کیلئے افغانستان کے ہمسائے ممالک نے بھی خود کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ امریکی انخلاء سے پہلے افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار پرامن طریقے سے انتقال اقتدار کا عمل وقوع پذیر ہوا جس میں حامد کرزئی کی جگہ اشرف غنی نے افغانستان کے صدارت کا منصب سنبھالا اور دوسرے نمبر پر آنے والے عبداللہ عبداللہ کو ملک چیف ایگزیکٹو بنایا گیا۔ افغانستان کی نئی حکومت کو ایساف افواج کے انخلاء کے پیش نظر آتے ہی سیکیورٹی کی صورت میں ایک بہت بڑے چیلینج کا سامنا ہے۔ جس کو مدنظر رکھتے ہوئے اشرف غنی نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے تحت 2015 تک تقریباً 12000 ہزار فوجی جن میں سے اکثریت امریکی ہیں افغانستان میں رہیں گے جو افغان افواج کی تربیت اور معاونت کے ساتھ ساتھ طالبان کے خلاف مشترکہ کاروائیوں میں بھی حصہ لیں گے۔ ایساف افواج کے انخلاء کے ساتھ ہی اس خطے پر بہت سے اثرات مرتب ہونگے جن میں سے فوری مسئلہ افغانستان کے سیکیورٹی کا ہے کیونکہ اس تیرہ سالہ جنگ کے باوجود ابھی تک طالبان بھرپور طاقت رکھتے ہیں اور وہ تواتر کے ساتھ مغربی افواج اور افغان فوج و پولیس پر حملے کر رہا ہے۔ منصوبے کے مطابق ان

ایساف افواج کے انخلاء کے ساتھ ہی اس خطے پر بہت سے اثرات مرتب ہونگے جن میں سے فوری مسئلہ افغانستان کے سیکیورٹی کا ہے کیونکہ اس تیرہ سالہ جنگ کے باوجود ابھی تک طالبان بھرپور طاقت رکھتے ہیں اور وہ تواتر کے ساتھ مغربی افواج اور افغان فوج و پولیس پر حملے کر رہا ہے۔ منصوبے کے مطابق ان سے نمٹنے کیلئے نیٹو افغان فوج اور پولیس کی تربیت تو کر رہا ہے لیکن یہ عمل ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے اور دوسری طرف پاکستان مبینہ طور پر افغان طالبان کی مکمل پشت پناہی کر رہا ہے اور انہیں اسلحہ اور پیسے کے ساتھ ساتھ محفوظ پناہ گاہیں بھی فراہم کر رہا ہے جس کی وجہ سے افغان فوج کو ان سے مقابلہ کرنے کیلئے اب تک کمزور سمجھا جاتا ہے

سے نمٹنے کیلئے نیٹو افغان فوج اور پولیس کی تربیت تو کر رہا ہے لیکن یہ عمل ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے اور دوسری طرف پاکستان مبینہ طور پر افغان طالبان کی مکمل پشت پناہی کر رہا ہے اور انہیں اسلحہ اور پیسے کے ساتھ ساتھ محفوظ پناہ گاہیں بھی فراہم کر رہا ہے جس کی وجہ سے افغان فوج کو ان سے مقابلہ کرنے کیلئے اب تک کمزور سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا کے نوے فیصد افیون کی پیداوار افغانستان میں ہوتا ہے، منشیات کا یہ کاروبار افغانستان کے جی ڈی پی کا تین چوتھائی حصہ بنتا ہے، امریکی افواج کے انخلاء کیساتھ ہی افیون کے پیداوار میں بے تحاشہ اضافہ ہو جائے گا اور بدقسمتی سے اسکا سب سے زیادہ فائدہ طالبان کو ہی ہوگا کیونکہ طالبان کے زیادہ تر فنڈز کا ذریعہ یہی کاروبار ہے۔ اسکے ساتھ افغانستان کے معیشت کے بارے میں بھی بہت سے قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، اس وقت افغانستان کے بجٹ کا نوے فیصد بیرونی امداد سے آتا ہے، جس کی وجہ سے

بلوچستان افغانستان کے سرحد پر واقع ہے اور بلوچ وافغان کئی صدیوں سے تاریخی تعلقات رکھتے ہیں، افغانستان کے حالات کا بلوچستان پر ہمیشہ سے ہی بلا واستہ اثر پڑتا رہا ہے۔اب امریکی انخلاء کے بعد کے اثرات سے بھی بلوچستان محفوظ نہیں رہ سکتا۔اسی ضمن میں بلوچ قوم دوست رہنما حیر بیار مری نے بھی ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان ہمیشہ سے توسیع پسند عزائم رکھتا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہمسایہ اقوام کے امن کو تہہ وبالا کیا ہوا ہے اور بلوچستان پر قبضہ وافغانستان میں دہشت گردی بھی پاکستان کے انہی توسیع پسندانہ عزائم کے شاخسانے ہیں۔

افغانستان کی پوری معیشت بیرونی امداد پر منحصر ہوگئی ہے اس حوالے سے ورلڈ بینک نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اگر ایساف افواج کے انخلاء کے بعد بیرونی امداد ملنا رک جاتا ہے تو افغانستان کا معیشت فوری طور پر بیٹھ جائے گا۔افغانستان پر امریکی قبضے کے بعد یہاں بہت سے سماجی اصلاحات متعارف کیئے گئے تھے،خواتین کو مردوں کے برابر لا کھڑا کیا گیا تھا،اس وقت افغانستان میں چوبیس لاکھ افغان بچیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں جبکہ طالبان کے وقت انکی تعداد بمشکل پانچ ہزار تھی،اسکے علاوہ نوکریوں اور سیاست میں بھی خواتین کی شرکت حوصلہ افزاء رہا لیکن اب امریکی انخلاء کے پیش نظر ان خدشات کا اظہار کیا جائے گا یہ اصلاحات ابتک کمزور حالت میں ہیں اگر طالبان دوبارہ اس خطے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھاتے ہیں تو ان اصلاحات پر بہت ہی منفی اثرات پڑیں گے۔لیکن ان سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ امریکی انخلاء کے بعد اس خطے میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور طاقت کا ایک خلاء آجائے گا جسے پر کرنے کیلئے ابھی سے پاکستان، ایران، بھارت اور چین کمربستہ ہوچکے ہیں اور صف بندیاں کررہے ہیں۔اس ضمن میں سب سے بڑا چیلینج پاکستان ہے جو 80 کے دہائی سے ہی طالبان کی افزائش کررہا ہے جسکی وجہ سے اسکے تعلقات افغان طالبان خاص طور پر حقانی نیٹورک سے بہت گہرے ہیں، ماہرین کا یہاں تک کہنا ہے کہ پاکستانی خفیہ ادارے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی ہونے کے باوجود ڈبل گیم کرتا رہے ہیں،ایک طرف وہ امریکا و دوسرے مغربی ممالک سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بہانہ بناکر امداد وصول کرتا رہا اور دوسری طرف وہ افغان طالبان کی معاشی اور عسکری مدد کرتا رہا ہے اور ہر مشکل حالت میں افغان طالبان خاص طور پر حقانی نیٹورک کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں بھی مہیا کرتا رہا ہے حتیٰ کے یہ تک کہا جاتا ہے کہ افغان طالبان کا شوریٰ اس وقت پاکستان فوج کے حفاظت میں کوئٹہ کنٹونمنٹ میں ہے اور وہاں سے ہی طالبان کو لیڈ کررہے ہیں۔ایسی صورتحال میں جب خطے میں طاقت کا تواز بدل رہا ہے وہاں پاکستان ایک طرف طالبان کو اپنا تزویراتی اثاثہ سمجھ کر اسکی پرورش و حفاظت کررہا ہے اور دوسری طرف پاکستان موجودہ افغان حکومت کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔اس وجہ سے تجزیہ کار اس بات کی پیشن گوئی کررہے ہیں کہ پاکستان ایک بار پھر افغان طالبان کو افغانستان میں متحرک کرکے موجودہ افغان حکومت کو غیر مستحکم کرکے وہاں اپنے ہمنوا طالبان کا اثر ونفوذ قائم کرنا چاہیں گے، انہی عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے افغانستان میں دہشت گردانہ کاروائیوں میں اضافے کو پاکستان کے ان ارادوں سے نتھی کیا جارہا ہے۔ بلوچستان افغانستان کے سرحد پر واقع ہے اور بلوچ وافغان کئی صدیوں سے تاریخی تعلقات رکھتے ہیں، افغانستان کے حالات کا بلوچستان پر ہمیشہ سے ہی بلا واستہ اثر پڑتا رہا ہے۔اب امریکی انخلاء کے بعد کے اثرات سے بھی بلوچستان محفوظ نہیں رہ سکتا۔اسی ضمن میں بلوچ قوم دوست رہنما حیر بیار مری نے بھی ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان ہمیشہ سے توسیع پسند عزائم رکھتا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہمسایہ اقوام کے امن کو تہہ وبالا کیا ہوا ہے اور بلوچستان پر قبضہ وافغانستان میں دہشت گردی بھی پاکستان کے انہی توسیع پسندانہ عزائم کے شاخسانے ہیں،انہوں نے عالمی برادری سے اپیل بھی کی تھی انخلاء سے پہلے پاکستان کو پنجاب کے سرحدوں تک محدود کیا جائے اور بلوچ سمیت باقی سیکیولر مقبوضہ اقوام کی آزادی یقینی بنایا جائے ورنہ پاکستان اپنے تزویراتی گہرائی کے فلسفے پر عمل پیرا ہوکر طالبان کی پشت پناہی کرتے ہوئے افغانستان کا امن برباد کردے گا جس کے ہولناکیوں کے اثرات پوری دنیا پر پڑیں گے،انہوں نے امریکہ سے بھی مطالبہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کو دی جانے والی امداد پر نظر ثانی کریں کیونکہ یہی امداد افغانستان میں دہشت گردوں کو پالنے اور بلوچوں کو محکوم رکھنے کیلئے استعمال کررہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بلوچ پناہ گزینوں کے خلاف پاکستانی جارحیت

☆ ___________ ☆

بلوچستان گذشتہ ایک طویل عرصے سے بدترین ریاستی تشدد و بربریت کا شکار رہا ہے، پاکستان کے ساتھ جبری الحاق سے لیکر آج تک بلوچستان میں ہر وقت چھوٹے یا بڑے پیمانے کے آپریشن ہوتے رہے ہیں، ان آپریشنوں میں بلوچ سول آبادیوں پر بلاتفریق بمباری، آزادی پسند سیکیولر سیاسی کارکنان کا جبری اغواء، لاپتہ افراد کو شدید تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد انکی مسخ شدہ لاشیں پھینکنا، سیاسی کارکنان کو زندہ ہیلی کاپٹروں سے گرا کر شہید کرنا، ٹارگٹ کلنگ، دیہی علاقوں میں غریب بلوچوں کے مال و مویشی پر بلااشتعال شیلنگ و لوٹ مار، کھڑی فصلوں کو آگ لگانا، عام بلوچ آبادیوں کو بلڈوز کر کے انکے مکانات منہدم کرنا شامل رہی ہیں۔ ریاستی دہشت گردی کے شدت میں گذشتہ ایک دہائی سے مزید شدت دکھائی دیتی ہے صرف آخری ایک دہائی کے دوران کم از کم اٹھارہ ہزار سے زائد متحرک بلوچ سیاسی کارکنان کو خفیہ ادارے اغواء کر کے لاپتہ کر چکے ہیں ان میں سے سولہ سو سے زائد کی تشدد زدہ مسخ شدہ لاشیں بلوچستان کے شہروں اور ویرانوں میں نشان عبرت کیلئے پھینکی جا چکی ہیں، بلوچستان کے علاقے توتک مژی میں ایک اجتماعی قبر بھی دریافت ہو چکا ہے جس سے 169 گمشدہ بلوچوں کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہو چکی ہیں اور اسی طرح بلوچستان کے علاقے وڈھ باڈڑی، خضدار فیروز آباد اور پشین میں مزید اجتماعی قبروں کی اطلاعات ہیں۔ صرف سال 2013 کے دوران بلوچستان کے مختلف علاقوں میں گوادر سے لیکر بارکھان تک 100 سے زائد بڑے پیمانے کے فوجی آپریشن کیئے جا چکے ہیں جن میں جیٹ طیاروں، گن شپ ہیلی کاپٹروں اور بکتر بند گاڑیوں کا بے دریغ استعمال کیا جاتا رہا ہے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بلوچ آبادیوں پر فورسز کی جانب سے مارٹر گولوں سے بلااشتعال بمباری بھی اب معمول بن چکا ہے ان آپریشنوں میں درجنوں عام بلوچ شہید، سینکڑوں اغواء اور ہزاروں گھر جلائے جا چکے ہیں۔ اس وقت بلوچستان ایک مکمل جنگ زدہ علاقے کی صورت پیش کر رہا ہے۔ اس طویل جنگی صورتحال میں خاص طور پر بلوچ سیاسی کارکنان سخت متاثر رہے ہیں، اس کے علاوہ اس جنگ کے اثرات بلوچ سماج پر بھی گہرے نقوش چھوڑ رہا ہے، بلوچ معاشی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندگی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس ریاستی دہشت گردی کے اثرات سے بچنے کیلئے بلوچ خاص طور پر بلوچ سیاسی کارکنان اپنے جان و مال کے حفاظت کے غرض سے بڑی تعداد میں اپنے آبائی سرزمین سے ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس وقت بڑی تعداد میں بلوچ سندھ، افغانستان اور خلیجی ممالک ہجرت کر چکے ہیں اسکے علاوہ زندگی کے تحفظ کو لیکر بڑی تعداد میں بلوچ سیاسی کارکنان یورپ، امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں بھی پناہ لیئے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال عالمی و علاقائی میڈیا کے نظروں سے بالکل اوجھل ہے اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی خفیہ اداروں اور فوج نے بلوچستان کو صحافیوں کیلئے ایک ممنوعہ علاقہ قرار دیا ہوا ہے، کسی بھی پاکستانی یا عالمی صحافی کو اجازت نہیں کہ وہ بلوچستان کے ان حالات کو فلمبند یا قلمبند کرے، بلوچوں کا اپنا میڈیا ریاستی پابندیوں اور حملوں کا شکار ہونے کی وجہ سے اس ظلم و بربریت کو دنیا کے سامنے آشکار کرنے کی مکمل صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستانی فوج کے دباو میں پاکستانی میڈیا بلوچستان کی بالکل غلط اور متضاد رپورٹنگ کرتا آ رہا ہے اور عالمی میڈیا کسی بھی خبر کیلئے پاکستانی میڈیا پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں بلوچستان میں جاری ریاستی دہشتگردی اور تشدد کو دنیا کے سامنے آشکار کرنے کا واحد ذریعہ وہ بلوچ سیاسی کارکنان رہے ہیں جو اس وقت بحالتِ مجبوری امریکہ، کینیڈا، یورپ، خلیجی ریاستوں اور افغانستان میں پناہ لیئے ہوئے ہیں۔ اب بلوچوں کے آواز کو مزید دبانے کیلئے پاکستانی فوج اور اسکے خفیہ ادارے بیرونی ممالک میں بھی بلوچوں کی آواز کو دبانے اور انکے لیئے عرصہ حیات تنگ کرنے کیلئے متحرک ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلے میں گذشتہ ماہ پاکستان کے وزیر اعظم خلیجی ملک بحرین، چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف اور ڈی جی آئی ایس آئی رضوان اختر افغانستان کا دورہ کر چکے ہیں اور ان دوروں میں وہ مذکورہ ممالک پر دباو ڈال رہے ہیں کہ وہ جنگ زدہ بلوچ سیاسی کارکنان کی آواز دبائیں اور کچھ متحرک کارکنان کو انکے حوالے کریں۔ اسی مد میں گذشتہ دنوں پاکستان کے سینٹ کے قائمہ کمیٹی برائے خارجہ امور کا جاری کردہ بیان بھی حالات کی صحیح ترجمانی یوں کر رہا ہے کہ اس میں بلوچستان کو مفتوحہ علاقہ ظاہر کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہاں پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا گیا اور پاکستان کے سیکریٹری خارجہ اعزاز چوہدری نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ بلوچ سیاسی کارکنان کیلئے عرصہ حیات تنگ کرنے کے غرض سے کئی یورپی ممالک سے رابطہ کر چکے ہیں۔ اسی تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے اسی ہفتے پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف اور ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل عاصم باجوہ برطانیہ کا دورہ کر چکے ہیں جہاں انہوں نے لندن میں مقیم بلوچ آزادی پسند رہنما حیربیار مری اور دوسرے بلوچ سیاسی کارکنان

اس وقت بلوچستان ایک مکمل جنگ زدہ علاقے کی صورت پیش کر رہا ہے۔اس طویل جنگی صورتحال میں خاص طور پر بلوچ سیاسی کارکنان سخت متاثر رہے ہیں، اس کے علاوہ اس جنگ کے اثرات بلوچ سماج پر بھی گہرے نقوش چھوڑ رہا ہے، بلوچ معاشی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندگی کا شکار ہورہے ہیں ۔اس ریاستی دہشت گردی کے اثرات سے بچنے کیلئے بلوچ خاص طور پر بلوچ سیاسی کارکنان اپنے جان و مال کے حفاظت کے غرض سے بڑی تعداد میں اپنے آبائی سرزمین سے ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔اس وقت بڑی تعداد میں بلوچ سندھ، افغانستان اور خلیجی ممالک ہجرت کر چکے ہیں اسکے علاوہ زندگی کے تحفظ کو لیکر بڑی تعداد میں بلوچ سیاسی کارکنان یورپ، امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں بھی پناہ لیئے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال عالمی و علاقائی میڈیا کے نظروں سے بالکل اوجھل ہے اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی خفیہ اداروں اور فوج نے بلوچستان کو صحافیوں کیلئے ایک ممنوعہ علاقہ قرار دیا ہوا ہے، کسی بھی پاکستانی یا عالمی صحافی کو اجازت نہیں کہ وہ بلوچستان کے ان حالات کو فلمبند یا قلمبند کرے، بلوچوں کا اپنا میڈیا ریاستی پابندیوں اور حملوں کا شکار ہونے کی وجہ سے اس ظلم و بربریت کو دنیا کے سامنے آشکار کرنے کی مکمل صلاحیت نہیں رکھتا

کے حوالگی اور پابندیوں کا مطالبہ کیا ہے۔ بلوچوں کے مری قبیلے سے تعلق رکھنے والے حیر بیار مری بلوچستان کے ایک مقبول آزادی پسند رہنما ہیں، جو ماضی میں بلوچستان کے پارلیمنٹ میں بلوچوں کی نمائیندگی کر چکا ہے لیکن بعدازاں انہوں نے پاکستان کو غیر جمہوری ملک قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کو بے معنی کہہ کر وہاں سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔اب وہ ایک طویل عرصے سے لندن میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں جہاں وہ مختلف فورموں میں بلوچستان میں ہونے والے ظلم و زیادتیوں اور ناجائز قبضے کے حوالے سے عالمی میڈیا اور مہذب اقوام تک اپنی آواز پہنچا رہے ہیں، پاکستان کے اس پالیسی پر کئی بلوچ قوم پرست تنظیموں نے کڑی تنقید کرتے ہوئے اسکی شدید مذمت کی ہے، اس مد میں بلوچ آزادی پسند حلقے یہ موقف پیش کر رہے ہیں کہ بلوچستان ایک ناجائز قبضے اور طویل آپریشنوں اور ظلم و جبر کا شکار ملک ہے۔اپنے جان کی حفاظت کیلئے دوسرے ممالک ہجرت کرنا، وہاں پناہ حاصل کرنا اور جبر کے شکار بلوچوں کی آواز مہذب اقوام و عالمی اداروں کے سامنے بلند کرنا بلوچ سیاسی کارکنان کا بنیادی انسانی و سیاسی حق ہے۔ جسے انسانی حقوق کے عالمی قوانین یقینی بناتے ہیں۔ دہشتگردی کا سرغنہ پاکستان اب اپنے پالے ہوئے پراکسی جہادیوں کو بطورِ ایک بلیک میلنگ حربہ استعمال کرتے ہوئے جہاں مغربی ممالک سے امداد سمیٹ رہا ہے وہیں وہ اپنے پیدا کیئے ہوئے جہادیوں کا خوف استعمال کرتے ہوئے مغربی و خلیجی ممالک اور افغانستان پر دباو ڈال رہا ہے کہ وہ پرامن بلوچ سیاسی کارکنان کے خلاف اقدامات کریں۔ یاد رہے یونیورسل ڈکلیریشن آف ہیومن رائٹس کے آرٹیکل 14 کا شق نمبر 1 ہر انسان کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ریاستی جبر و تشدد سے بچنے کیلئے کسی بھی ملک میں سیاسی پناہ حاصل کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆

بلوچستان میں چینی اسلحہ،عربی پیسے اور پاکستانی فوج کی دہشت گردی

☆ ☆

وکی لیکس نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات ہر سال کم از کم 100 ملین ڈالر کا رقم خیرات و چندوں کی صورت میں پاکستانی دہشتگرد تنظیموں کو دیتے ہیں، جس سے یہ دہشتگرد تنظیمیں فائدہ اٹھاتے ہوئے خاص طور پر جنوبی پنجاب سے بھرتیاں کرتے ہیں، ان انکشافات میں مزید یہ کہا گیا ہے کہ ’’دہشتگرد آٹھ سال تک کے بچے بھی بھرتی کرتے ہیں جنہیں بعدازاں باہری دنیا سے کاٹ کر کم عمری میں ہی انکی تربیت شروع کیا جاتا ہے، غربت اور زیادہ بچوں کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو پال نہیں سکتے اسلئے وہ بھی پیسوں اور بچوں کے مفت ضروریاتِ زندگی کی خاطر انہیں ان خیراتی اداروں کے بھیس میں چھپے دہشتگرد تنظیموں کے حوالے کرتے ہیں، یہ رقم سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے خیراتی اداروں اور چندوں کی صورت میں پاکستان منتقل ہوتا ہے، جہاں یہ دہشتگرد تنظیم دورافتادہ اور غربت زدہ علاقوں میں مسجد اور مدارس تعمیر کرتے ہیں، جہاں غربت سے تنگ لوگ اپنے بچوں کو داخل کراتے ہیں، کم عمری میں ہی بچوں کے ذہن میں مقدس جنگ کا فلسفہ ٹھونس کر انہیں ٹریننگ کیمپ بھیج دیئے جاتے ہیں، سعودی عرب اپنے طرز کے وہابی اسلام کی ترویج انہی دہشتگرد تنظیموں کی مدد سے مدرسوں کی جدید نیٹ ورک کی صورت میں کررہا ہے۔ جس سے دہشت گردی جنم لے رہی ہے‘‘۔ مذکورہ باتیں شاید مغربی اقوام کیلئے انکشافات ہوں لیکن اس خطے میں موجود لوگ دہائیوں سے اس عمل کو اپنے آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھتے آرہے ہیں، یہ اب ہرگز ایک راز نہیں رہا ہے کہ دورافتادہ علاقوں میں جہاں حکومت کے اسکول تک نہیں ہوتے وہاں عالیشان مسجدوں اور وسیع وعریض مدرسوں پھر مدرسے کے طلبا کے خرچوں کی رقم کہاں سے آتی رہی ہے اور نا ہی یہ امر کسی کے آنکھوں سے پوشیدہ ہے کہ عرصہ دراز سے یہی مدرسے نابالغ بچوں کے ذہن میں دہشت گردانہ عزائم کا زہر گھول کر انہیں جہاد (دہشتگردی) کیلئے کشمیر و افغانستان بھیجتے آرہے ہیں، اس پورے عمل میں پاکستانی فوج اور اسکے خفیہ اداروں کی مکمل رغبت ورضا شامل رہی ہے تبھی اپنے ناک کے نیچے ہونے والے اس عمل کو وہ نظرانداز کرنے میں کامیاب رہا ہے، شاید وہ دن بھی زیادہ دور نہیں جب یہ حقائق بھی سامنے آجائیں کے پاکستان فوج و خفیہ اداروں کے اس نظر اندازی کے پیچھے اصل میں وہ بھاری رقوم ہوتے ہیں جو مذکورہ ممالک سے انہیں اسلامی برادر ملک کے نام نہاد نعروں کے آڑ میں فراہم کی جاتی رہی ہے۔ پنجاب میں مذہبی شدت پسندی کے رجحانات کسی بھی اور علاقے سے کئی گنا زیادہ ہیں اس لیئے وہ ان مدرسوں اور اور دہشت گردوں کے بھرتی کیلئے بہترین جگہ تصور کی جاتی رہی ہے، انہی مدرسوں کے طفیل ہمیں ’’پنجابی طالبان‘‘ کا اصطلاح بھی سنائی دیتا ہے۔ یہاں حیرت انگیز بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں پاکستان طالبان اور دہشت گرد مٹانے کے نام پر پختونوں پر بلا امتیاز بمباری اور انکے علاقوں کو تہس نہس کرتے آئے ہیں وہیں یہ پنجابی طالبان ہمیشہ سے پاکستانی فوج کی طرف سے خاص رعایت کے مستحق رہے ہیں حتیٰ کے آج جب پاکستان ضربِ عضب کے نام پر پوری دنیا سے پیسے بٹورنے میں مشغول ہے وہیں یہ پنجابی طالبان اور انکے سربراہان پنجاب میں بلاخوف و خطر کھلے عام گھومتے ہیں حتیٰ کے انکے مسلح کمانڈران جن کے سروں پر لاکھوں کا انعام ہے وہ بھی حال ہی میں اپنے گھروں میں سکون سے رہتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ اس کے وجوہات بیان کرتے ہوئے بی بی سی کے رپورٹر اوین بینیٹ کہتے ہیں کہ پاکستان ان پنجابی طالبان کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہے کیونکہ ایک طرف یہ کشمیر میں جہاد کے نام پر بھارت میں دراندازی کرکے دہشتگردانہ کاروائیاں کرتے ہیں اور دوسری طرف حقانی نیٹ ورک کی صورت میں افغان حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ اسی ضمن میں بلوچ آزادی پسند تنظیموں کا یہ موقف بھی قابلِ غور ہے کہ اب پاکستان اپنے ان دہشت گردانہ عزائم کو بلوچستان میں دہرانا چاہ رہا ہے، ایک سیکولر قوم ہونے اور لبرل اقدار کی وجہ سے بلوچ قوم ہمیشہ سے مذہبی شدت پسند نظریات سے خود کو بچانے میں کامیاب رہا ہے اور اعتدال پسندی و مذہبی رواداری کے

پاکستان ان پنجابی طالبان کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہے کیونکہ ایک طرف یہ کشمیر میں جہاد کے نام پر بھارت میں دراندازی کرکے دہشتگردانہ کاروائیاں کرتے ہیں اور دوسری طرف حقانی نیٹ ورک کی صورت میں افغان حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں

فلسفے پرعمل پیرا رہا ہے لیکن جنوبی پنجاب کی طرح اب پاکستانی فوج یہاں ایک منصوبے کے تحت پہلے مرحلے میں ان پنجابی طالبان کو لشکری جھنگوی اور جماعت الدعوة کی صورت میں بلوچستان منتقل کر کے انہیں یہاں محفوظ پناہ گاہیں مہیا کر رہا ہے، اسکے ساتھ ہی اسکولوں اور کالجوں کو روز بروز بند کر کے بلوچستان کے طول وعرض میں مدارس کا جال بچھایا جا رہا ہے، اب یہ یقینی امر ہے کہ تعلیمی ادارے نا ہونے اور پسماندگی کی وجہ سے عام بلوچ مجبوراً اپنے بچوں کو انہی مدارس میں داخل کرایں گے، اسی منصوبے کے دوسرے مرحلے میں پاکستان ان مذہبی شدت پسندوں کو روشن فکر بلوچ آزادی پسندوں کے خلاف ایک محاذ کے طور پر بھی استعمال کر رہا ہے، پاکستانی فوج اپنے پراکسی سرداروں ومیروں جیسے کے ثناء اللہ زہری، سراج رئیسانی، شفیق مینگل، برکت محمد حسنی وغیرہ کے سربراہی میں پنجاب سے درآمد کیئے گئے ان شدت پسندوں کے ڈیتھ اسکواڈ بنا چکی ہے جو بلوچ آزادی پسند

بلوچ آزادی پسندوں کے خلاف ان پاکستانی پراکسی دہشتگرد تنظیموں کی محاذ آرائی ایک طرف اور دوسری طرف یہ تنظیمیں بلوچستان کے صدیوں پر محیط مذہبی رواداری کو بھی پراگندہ کر رہے ہیں۔ یہی تنظیمیں پاکستانی فوج کے حصار کے اندر کوئٹہ میں شیعہ و ہزارہ برادری کے قتل عام، ذکری بلوچوں کے خلاف متعدد حملوں اور ہندو برادری کے اغواء میں ملوث رہے ہیں۔ بلوچ دانشور اور تجزیہ نگاروں کے مطابق اگر مغربی اقوام دہشت گردی کو بنیاد سے ختم کرنے میں سنجیدہ ہیں تو پھر انہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ انکے ٹیکس کا پیسہ پاکستان جیسے شدت پسند ملک کو امداد کی صورت میں نا ملے اور ساتھ میں انہیں اس خطے میں بلوچ کی صورت میں اپنے فطری روشن خیال اتحادیوں کو مضبوط کرنا ہوگا ورنہ پاکستان عرب ممالک کے پیسے، چین کے اسلحہ اور اپنی فوج کی مدد سے بلوچستان کو ایک اور شام، عراق یا افغانستان بنانے میں کامیاب ہو جائے گا جس سے نا صرف بلوچ جیسے اعتدال پسند قوم کی بقا بلکہ مغربی اقوام کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔

سیاسی کارکنان کو اغواء اور قتل میں تندہی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ ایک طرف پاکستان ان دہشت گرد گروہوں کو عسکری حوالے سے استعمال کر رہا ہے تو دوسری طرف پرامن بلوچ آزادی پسند سیاسی کارکنان کے بے دریغ قتل عام کے بعد بلوچستان میں ایک سیاسی خلاء پیدا کیا گیا ہے جسے پاکستان ان مذہبی شدت پسندوں کے ذریعے پُر کرنے کا عزم رکھتا ہے اور بلوچستان کا سیاسی کردار بھی انہیں سونپنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جماعت الدعوة اور جماعت اسلامی جیسے شدت پسند تنظیموں اور انکے خیراتی اداروں فلاح انسانیت فاونڈیشن اور خدمت خلق فاونڈیشن کو بلوچستان میں کھلی چھوٹ دی گئی ہے، ان کے توسط سے یہ غربت زدہ بلوچوں کو لشکرِ طیبہ جیسے دہشتگرد تنظیموں میں بھرتی کرنے کیلئے متحرک ہیں۔ اسی کی ایک مثال ہمیں گذشتہ سال بلوچستان کے علاقوں آواران اور مشکے میں زلزلے کے بعد دیکھنے کو ملا جب پاکستان نے وہاں نہ بلوچ تنظیموں کو کام کرنے کی اجازت دی اور نہ ہی کسی بھی عالمی ادارے کو وہاں داخل ہونے دیا لیکن وہاں حافظ سعید کی لشکر طیبہ فلاحِ انسانیت فاونڈیشن کے نام سے فوجی سیکیورٹی اور گاڈیوں میں نام نہاد فلاحی کاموں میں متحرک نظر آئی۔ بلوچ آزادی پسندوں کے خلاف ان پاکستانی پراکسی دہشتگرد تنظیموں کی محاذ آرائی ایک طرف اور دوسری طرف یہ تنظیمیں بلوچستان کے صدیوں پر محیط مذہبی رواداری کو بھی پراگندہ کر رہے ہیں۔ یہی تنظیمیں پاکستانی فوج کے حصار کے اندر کوئٹہ میں شیعہ و ہزارہ برادری کے قتل عام، ذکری بلوچوں کے خلاف متعدد حملوں اور ہندو برادری کے اغواء میں ملوث رہے ہیں۔ بلوچ دانشور اور تجزیہ نگاروں کے مطابق اگر مغربی اقوام دہشت گردی کو بنیاد سے ختم کرنے میں سنجیدہ ہیں تو پھر انہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ انکے ٹیکس کا پیسہ پاکستان جیسے شدت پسند ملک کو امداد کی صورت میں نا ملے اور ساتھ میں انہیں اس خطے میں بلوچ کی صورت میں اپنے فطری روشن خیال اتحادیوں کو مضبوط کرنا ہوگا ورنہ پاکستان عرب ممالک کے پیسے، چین کے اسلحہ اور اپنی فوج کی مدد سے بلوچستان کو ایک اور شام، عراق یا افغانستان بنانے میں کامیاب ہو جائے گا جس سے نا صرف بلوچ جیسے اعتدال پسند قوم کی بقا بلکہ مغربی اقوام کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

بلوچوں اور پشتونوں کے بیچ نا کوئی اختلاف ہے اور نا ہی کوئی فطری تضاد موجود ہے لیکن پاکستان کے پیدا گیر کچھ پارلیمانی نام نہاد بلوچ قوم پرست اور کچھ پشتون قوم پرست جماعتیں اپنے ووٹ بینک اور قابض ریاست کے پارلیمنٹ میں سیٹوں کی بڑھوتری کیلئے اپنے مفادات کے تحت انتشار اور فسادات پیدا کرتے رہتے ہیں

پشتونوں کے علیحدہ صوبے کا مطالبہ اور بلوچوں کا موقف

☆ ______________ ☆

پاکستان کے زیر قبضہ موجودہ مشرقی بلوچستان کے شمالی علاقہ جات میں پشتون آباد ہیں اور یہ انکی تاریخی سرزمین ہے، ماضی میں پشتون قوم پرست اکثر ان پر دعویٰ کرتے رہے ہیں اور پاکستان کے زیر انتظام علیحدہ پشتون صوبے اور کچھ پشتون قوم پرست ان علاقوں کی واپس افغانستان میں ضم کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اسی ضمن میں حال ہی میں ایک پشتون قوم پرست جماعت نے دوبارہ مطالبہ کیا ہے کہ پشتون علاقوں کو بلوچستان سے کاٹ کر ایک الگ صوبہ بنایا جائے، اس بابت انہوں نے مجبوری کا اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بلوچ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم ایک الگ صوبے کا مطالبہ کریں لیکن حقائق اسکے برعکس ہیں نا تاریخی طور پر بلوچوں نے یہ کوشش کی ہے کہ یہ پشتون علاقے بلوچستان میں شامل ہوجائیں اور نا ہی آج تک بلوچ قوم پرست ان علاقوں پر اپنا دعویٰ کرتے ہیں۔ 27 مارچ 1948 مشرقی بلوچستان پر پاکستانی قبضے کے بعد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بلوچ اور پشتون علاقے جغرافیائی لحاظ سے ایک ہی خطے میں ہونے کے باوجود دو بالکل الگ الگ علاقے ہیں جنہیں 1970ء میں قابض پاکستان نے ون یونٹ توڑنے کے بعد ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا، اس انضمام کی اس وقت بھی بلوچ قوم پرستوں نے شدید مخالفت کی تھی پشتون علاقوں کو ایک بلوچستان میں جوڑنے اور ایک غیر فطری خودساختہ صوبہ بنانے میں نا بلوچوں کی کبھی رضا شامل تھی اور نا ہی یہ کبھی بلوچوں کی خواہش رہی ہے، اس انضمام کا مقصد قومیت کے حساب سے غیر مساوی تقسیم کرتے ہوئے نئے صوبے بنانا تھا تاکہ پنجاب کی بالادستی قائم ہو اور دوسرے

موجودہ بلوچستان میں موجود پشتون علاقے 1879ء سے پہلے افغانستان کا حصہ تھے۔ دوسری اینگلو افغان جنگ میں افغانستان کو مغلوب کرنے کے بعد انگریزوں نے ان علاقوں کو ایک جبری معاہدے گنڈمک معاہدے کے تحت براہ راست اپنی عملداری میں شامل کرلیا۔ گنڈمک معاہدہ 26 مئی 1879 کو کابل سے متصل ایک علاقے گنڈمک کے علاقے میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ معاہدہ افغانستان کے بادشاہ خان محمد یعقوب خان اور برطانوی حکومت کے نمائندے سر پییئر لوئس کے بیچ طے پائی جس کے تحت ان علاقہ جات کو انہوں نے برٹش افغانستان کی بجائے برٹش بلوچستان کا نام دے دیا بعدازاں برطانوی راج نے خان آف قلات سے مختلف معاہدات کے ذریعے کوئٹہ سمیت چاغی، نوشکی، ڈیرہ بگٹی، کوہلو، سبی، بولان اور نصیر آباد کو لیز پر حاصل کر کے انہیں برٹش بلوچستان میں عارضی طور پر شامل کر دیا۔

اقوام ایک انتظام میں رہ کر اتحاد پیدا نا کر سکیں اور پاکستانی قبضہ تقویت پاتا رہے، اسی تناظر میں کئی بلوچ علاقوں جیسے کے ڈیرہ غازی خان اور جیکب آباد کو پنجاب اور سندھ میں ضم کر دیا گیا تھا۔ بلوچ جہاں پاکستان کے وجود کو بلوچستان پر قبضہ سمجھتے ہیں تو ان تقاسیم کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موجودہ بلوچستان میں موجود پشتون علاقے 1879ء سے پہلے افغانستان کا حصہ تھے۔ دوسری اینگلو افغان جنگ میں افغانستان کو مغلوب کرنے کے بعد انگریزوں نے ان علاقوں کو ایک جبری معاہدے گنڈ مک معاہدے کے تحت براہ راست اپنی عملداری میں شامل کرلیا۔ گنڈ مک معاہدہ 26 مئی 1879 کو کابل سے متصل ایک علاقے گنڈ مک کے علاقے میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ معاہدہ افغانستان کے بادشاہ خان محمد یعقوب خان اور برطانوی حکومت کے نمائیندے سر پیئر لوئس کے بیچ طے پائی جس کے تحت ان علاقہ جات کو انہوں نے برٹش افغانستان کی بجائے برٹش بلوچستان کا نام دے دیا بعد ازاں برطانوی راج نے خان آف قلات سے مختلف معاہدات کے ذریعے کوئٹہ سمیت چاغی، نوشکی، ڈیرہ بگٹی، کوہلو، سبی، بولان اور نصیر آباد کو لیز پر حاصل کر کے انہیں برٹش بلوچستان میں عارضی طور پر شامل کر دیا۔ 11 اگست 1947 کے مذاکرات و معاہدے میں جب برطانیہ نے بلوچستان کی آزادی تسلیم کی تھی تو اسکے ساتھ یہ بھی طے پایا تھا کہ بلوچستان کی 1839 کی حیثیت بحال ہوتی ہے یعنی لیز کے تمام معاہدات منسوخ ہوتے ہیں اور یہ تمام بلوچ علاقے ریاست قلات (بلوچستان) میں شامل ہوتے ہیں اور قانونی طور پر برٹش بلوچستان میں موجود پشتون علاقے بلوچستان کا حصہ نہیں تھے اور نا ہی بلوچوں نے ان پر دعویٰ کیا تھا، اصولاً تو انہیں افغانستان میں واپس ضم ہو جانا چاہئے تھا لیکن غیر فطری ڈیورنڈ لائن کی وجہ سے یہ ممکن نا ہوسکا اور بعد میں پاکستانی قبضے کے بعد نا صرف ان پشتون علاقوں بلکہ مستجار بلوچ علاقوں کو ایک جبری اور نام نہاد کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے ریفرنڈم میں پاکستان میں شامل کرلیا گیا ۔ یہ صورتحال پاکستانی قبضے کے بعد بھی جاری رہی مغربی پاکستان کا ون یونٹ قائم ہوا تو بلوچ علاقوں کو قلات ڈویژن اور پشتون علاقوں کو کوئٹہ ڈویژن کا نام دیا گیا ون یونٹ ٹوٹا تو دونوں ڈویژنوں کو ملا کر بلوچستان کے نام سے نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ یوں تو ان علاقوں پر بلوچوں اور پشتونوں کے بیچ نا کوئی اختلاف ہے اور نا ہی کوئی فطری تضاد موجود ہے لیکن پاکستان کے پیدا گیر کچھ پارلیمانی نام نہاد بلوچ قوم پرست اور کچھ پشتون قوم پرست جماعتیں اپنے ووٹ بینک اور قابض ریاست کے پارلیمنٹ میں سیٹوں کی بڑھوتری کیلئے اپنے مفادات کے تحت انتشار اور فسادات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ بلوچوں کی حقیقی نمائیندے آزادی پسند بلوچ قائدین کا موقف اس ضمن میں واضح اور دوٹوک رہا ہے۔ انکے مطابق موجودہ بلوچستان کے کھینچے گئے سیم وسر قابض کی طرف سے جبری طور پر کھینچے گئے ہیں بلوچوں کا پشتون علاقوں پر کوئی دعویٰ نہیں۔ آزاد بلوچستان کے نقشے میں پشتون علاقے شامل نہیں۔ حال ہی میں بلوچ آزادی پسند رہنما حیر بیار مری کا موقف بھی ایک انٹرویو کی صورت میں سامنے آیا تھا جس میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب بلوچستان آزاد ہوگا تو پشتونوں کو یہ مکمل حق حاصل رہے گا کہ وہ بلوچستان کی آزادی کی صورت میں اپنے تاریخی علاقہ جات پر اپنی عملداری قائم کرتے ہوئے ایک الگ ریاست بنائیں یا افغانستان کے ساتھ شامل ہو جائیں یا پھر پاکستان کے تسلط میں بدستور رہیں بلوچ اس میں دخل اندازی نہیں کریں گے اگر بلوچ و پشتون متصل علاقوں کو قومیت کے بنیاد پر تقسیم کا وقت آیا تو یہ مکمل گفت وشنید اور باہمی رضامندی سے طے ہوگا، اگر پشتون آزاد بلوچستان کا حصہ بننا چاہیں بھی تو انہیں خوش آمدید کہا جائیگا۔ گو کہ اس دوران ایک اور بلوچ آزادی پسند لیڈر ڈاکٹر اللہ نظر کی طرف سے پشتون قوم پرست جماعت پختونخواہ ملی عوامی پارٹی اور اسکے قائد محمود خان کو بلوچوں کا قاتل قرار دینے کا اشتعال انگیز موقف ٹوئٹر پر آیا تھا لیکن اس بابت آزادی پسند لیڈر حیر بیار مری کے قریبی حلقوں کی جانب سے یہ موقف بھی سامنے آیا کہ یہ ڈاکٹر اللہ نظر کی ذاتی رائے ہے بلوچ قوم کا مافی الضمیر یا پالیسی نہیں۔ بلوچ قوم پشتونوں کی آبائی سرزمین پر حق ملکیت اور جداگانہ شناخت کا احترام کرتے ہیں اور انکے اپنے علاقوں پر پشتون ملکیت کے دعووں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر پشتون ایک الگ صوبہ بنانا چاہتے ہیں تو حقیقی بلوچ آزادی پسند قیادت انکے سامنے کبھی رکاوٹ نہیں بنے گی بلکہ انکی حمایت کرے گی لیکن یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ پشتون گنڈ مک معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے صوبے کے بجائے نئے ملک یا افغانستان میں ضم ہونے کا مطالبہ کریں اور جدوجہد کریں۔ اسی طرح پشتونوں کو بھی بلوچوں کی تحریک آزادی میں رکاوٹ بننے کے بجائے اسکی حمایت کرنی چاہئے اور ہر ممکن مدد کرنی چاہئے۔ اسی ضمن میں قابض پاکستان اور کچھ جعلی قوم پرست جو تنازعات پیدا کرنا چاہتے ہیں انکا حقائق سے کوئی تعلق

جب بلوچستان آزاد ہوگا تو پشتونوں کو یہ مکمل حق حاصل رہے گا کہ وہ بلوچستان کی آزادی کی صورت میں اپنے تاریخی علاقہ جات پر اپنی عملداری قائم کرتے ہوئے ایک الگ ریاست بنائیں یا افغانستان کے ساتھ شامل ہو جائیں یا پھر پاکستان کے تسلط میں بدستور رہیں بلوچ اس میں دخل اندازی نہیں کریں گے اگر بلوچ و پشتون متصل علاقوں کو قومیت کے بنیاد پر تقسیم کا وقت آیا تو یہ مکمل گفت وشنید اور باہمی رضامندی سے طے ہوگا، اگر پشتون آزاد بلوچستان کا حصہ بننا چاہیں بھی تو انہیں خوش آمدید کہا جائیگا

نہیں اسلئے ان سازشوں کا بلوچوں اور پشتونوں کو ملکر مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کا معاون بننا چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆